کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ

خلیق انجم

ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر : شاہد علی خاں

مہمان اڈیٹر : خلیق انجم

معاون : ایم حبیب خاں

جلد نمبر : ۳۲

شمارہ نمبر : ۱

قیمت سالانہ : 55/= روپے

فی پرچہ : 6/= روپے

غیر ممالک کے لیے : ۲۴۰/= روپے

تقسیم کار

صدر دفتر :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار : جنوری ۹۲ء

تعداد 500

قیمت : 25/=

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

فہرست

خلیق انجم (مہمان مدیر)

اشاریہ

نیاز فتح پوری کے بعد سرزمین فتح پور اپنے جس سپوت پر ناز کر سکتی ہے، وہ ہیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔
ڈاکٹر سید دلدار علی فرمان فتح پوری اردو کے ممتاز ترین محقق، نقاد اور املا و رسم الخط کے ماہر ہیں اب تک اُن کی تقریباً چالیس کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔
فرمان صاحب کا آبائی گاؤں ہندوستان میں دریائے گنگ کے کنارے پر واقع ہے۔ یہیں ۱۹۲۶ء میں اُن کی ولادت ہوئی۔
اُن کے والد سید عاشق علی پولس انسپکٹر تھے۔ سب سے بڑے بھائی سید اشفاق علی صاحب بھی پولس میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ فرمان صاحب کی دو بہنیں سیدہ خاتون صاحبہ، طیبہ خاتون صاحبہ تھیں۔ یہ دونوں خدا کو پیاری ہو چکی ہیں۔ سید اشفاق علی صاحب کا عین جوانی میں کالرا کے مرض میں انتقال ہو گیا۔ والد سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو سکا اور ۱۹۳۲ء میں اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ چار بھائی بہنوں میں صرف ایک بھائی سید شمشاد علی حیات ہیں، فرمان صاحب کا تعلق ایک زمین دار خاندان سے ہے، زمین داری بہت معمولی سی تھی۔ اس لیے والد کی وفات کے بعد انھیں اپنی زندگی بنانے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے ۱۹۴۶ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ہائی اسکول، ۱۹۴۸ء میں ایف۔ اے اور ۱۹۵۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ بی۔ اے پاس کر کے فرمان صاحب ملازمت کی تلاش میں پاکستان چلے گئے۔ کراچی میں انھیں آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں ڈویژنل اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے ساتھ انھوں نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی ۱۹۵۳ء میں ایل۔ بی۔ ۱۹۵۵ء میں بی۔ ٹی اور ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کے امتحانات پاس کیے ۱۹۶۴ء میں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے "اردو کی منظوم داستانیں" کے موضوع پر پی ایچ ڈی اور ۱۹۷۴ء میں "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" کے موضوع پر ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ سے استعفا دے دیا تھا۔ چوں کہ انھیں درس و تدریس میں دلچسپی تھی، اس لیے ۱۹۵۵ء میں کراچی کے گورنمنٹ اسکول میں استاد کے عہدے پر فائز ہوئے اور دو تین سال بعد ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر کے عہدے پر تقرر ہوا۔ اس شعبے میں انھوں نے ترقی کے تمام مدارج طے کیے وہ اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے شعبے کے صدر کی حیثیت سے بھی کافی عرصے تک کام کیا۔ ۱۹۸۵ء میں اردو ڈکشنری بورڈ میں مدیر اعلا اور سکریٹری کے اہم عہدے پر اُن کا تقرر ہوا اور آج تک اسی عہدے پر فائز ہیں۔
۱۹۴۷ء میں فرمان صاحب کی اپنی خالہ زاد بہن سلمیٰ بیگم سے شادی ہوئی۔ ان کے چھ بچے ہیں۔ سید ابرار علی شمیم سلمان صاحبہ، انجم فرمان، سید ابصار علی، وسیم فرمان اور عظمیٰ فرمان۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام بچوں نے اعلا تعلیم حاصل کی اور خدا کا شکر ہے کہ سب خوش و خرم ہیں اور کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ عظمیٰ ابھی ایم۔ اے کر رہی ہیں۔

باقی سب بچوں کی شادی ہو چکی ہے۔ فرمان صاحب دادا اور نانا بن کر زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

فرمان صاحب کی اب تک تقریباً چالیس کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کے موضوعات بہت مختلف ہیں۔ انھوں نے غالب، میر انیس، علامہ اقبال اور نیاز فتحپوری مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ پر مستقل کتابیں لکھیں ہیں۔ افسانہ، رباعی، تاریخ گوئی مثنوی اور اردو نظم پر بھی اُن کی کتابیں بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے زبان کے مسئلے پر ہندی اردو تنازع۔ زبان اور اردو زبان، اردو املا اور رسم الخط جیسے اہم موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ تنقیدی موضوعات پر ان کی کتابیں تاویل و تعبیر، نیا اور پرانا ادب اور نثر کا فی ارتقا، اردو نظم کا فی ارتقا اور تحقیقی موضوعات اُن کی کتابیں منظوم داستانیں، اردو شعرا کے تذکرے اور اردو تذکرہ نگاری، اردو کی نعتیہ شاعری، فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

عام روایت ہے کہ ہم فن کار کی زندگی میں تو اس کے فن کی محض خرابیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ بلکہ اُس کے فن اور شخصیت میں وہ خامیاں بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں، جن کا اس فنکار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یا اس کے انتقال فرمانے کے بعد اس فن کار کا ماتم کرتے ہیں، اس کی عظمت کے گیت گاتے ہیں اور اس کے فن میں وہ خوبیاں بھی تلاش کر لیتے ہیں، جو نہیں ہوتیں، خدا سلامت رکھے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ڈائرکٹر اور کتاب نما کے اڈیٹر شاہد علی خاں کو جنھوں نے اردو ادیبوں اور شاعروں پر کتاب نما میں گوشے شایع کرنے شروع کیے ہیں۔ کبھی کبھی ان گوشوں کو وہ کتابی صورت بھی دے دیتے ہیں، میں شاہد صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے فرمان نمبر کے سلسلے میں میری درخواست قبول کی اس نمبر کی تیاری میں میرے محترم کرم فرما مالک رام کی غیر معمولی دلچسپی کو دخل ہے۔

ایک مہینے میں ایسے اچھے نمبر کی تیاری آسان کام نہیں تھا۔ اس نمبر کی تیاری کے کام کی تقسیم اس طرح تھی کہ میں نے ادیبوں اور نقادوں کو خطوط لکھ کر مقالے منگوائے، ایم۔ حبیب خان صاحب نے کتابت اور اس کی تصحیح میں دن رات ایک کیا اور شاہد علی خاں صاحب نے دو تین دن ہی میں طباعت کے تمام مرحلے طے کیے۔ اس لیے میں ایک بار پھر مالک رام صاحب، شاہد علی خاں صاحب اور ایم حبیب صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا میرے بزرگ مالک رام صاحب اور شاہد صاحب اور حبیب صاحب جیسے دوستوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔

مالک رام

فرمان فتحپوری

نظم اور نثر میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اگر کسی شاعر سے زبان یا محاورے کی کوئی غلطی ہو جائے، تو نقاد بسا اوقات یہ کہہ کر اسے معاف کر دیتا ہے کہ شاعر کسی شعری مجبوری کے باعث اس غلطی سے اجتناب نہ کر سکا۔ لیکن نثر نگار کے لیے ایسی کوئی رعایت نہیں۔ اس کی غلطی لازماً اس کی کم علمی کی دلیل سمجھی جائے گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نثر نگار کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے، اسے زبان کے تمام پہلوؤں ـــــ محاورہ، روزمرّہ، تذکیر و تانیث، فصاحت و بلاغت، الفاظ کے در و بست وغیرہ ـــــ پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ وہ اپنی ساکھ کھو بیٹھے گا، اور قاری اور نقاد دونوں اسے نظر انداز کر دیں گے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری بنیادی طور پر نثر نگار ہیں۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ ان کی نثر میں وہ تمام خوبیاں ہیں، جو اچھی نثر کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہیں۔ ان کی زبان میں ثقالت نہیں ہے۔ ادھر جب سے ملک میں فارسی کا رواج کم ہوا ہے، ہمارے اردو مصنفین غالباً اپنے علم و فضل کی نمائش کے لیے۔ اپنی تحریروں میں فارسی عربی کے بھاری بھرکم الفاظ اور ترکیبیں بے تکلف استعمال کرنے لگے ہیں۔ بہت کم اردو لکھنے والے اس روش سے بچ سکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ اپنا مدعا اور مافی الضمیر خالص اردو میں بیان کرنے پر قادر نہیں رہے یا پھر اردو زبان ہمارا ساتھ دینے سے قاصر ہے)

دوسری غلطی محاورے اور روزمرّے سے عدم واقفیت کی ہے۔ پہلے تو محاورہ اب دیکھنے ہی میں کم آتا ہے اور جب کوئی بھولے بھٹکے اسے استعمال کرتا ہے، تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بیشتر وہ غلط یا بے محل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہم لوگ سوچتے انگریزی میں ہیں، پڑھتے انگریزی کی کتابیں ہیں؛ دن بھر ہمارا تعلق ایسے انگریزی دان حضرات سے رہتا ہے، جو انگریزی الفاظ کی آمیزش کے بغیر اردو کے "صحیح جملے نہیں بول سکتے۔ ایسے میں اگر ہماری زبان اپنی خصوصیات سے عاری ہو جائے، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے!

میری طالب علمی کے زمانے میں ہمیں جو نصاب پڑھایا جاتا تھا، اس میں مختلف مستند اساتذہ کی تحریروں کے اقتباس تھے، نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ یہ سب وہ شاعر اور نثر نگار تھے، جن کی زبان اور فن کی واقفیت مسلّم تھی اور کسی لفظ کے صحیح یا غلط استعمال پر انھیں حضرات کو بطور سند پیش کیا جاتا تھا۔ طالب علم ان کی تحریریں پڑھ کر الفاظ کے صحیح استعمال کا علم اور سلیقہ سیکھتا تھا۔ آپ ہی خدا لگتی کہیے کہ پچھلے ۳۰۔۴۰ برسوں میں جو ادیب اور مصنف اور شاعر سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے کتنے اس لائق ہیں کہ ان کا کلام آپ بطور سند پیش کر سکتے ہیں اور ان میں سے کتنے اصحاب کہ آپ بطور نمونہ صحیح اردو پڑھانے اور سکھانے کے لیے پیش کریں گے۔

زبان سیکھنے کے دو طریقے ہیں۔ آدھی آنکھ سے، آدھی کان سے۔ آنکھ سے سیکھنے کا رواج آہستہ آہستہ غائب ہو گیا ہے، لوگوں کو کتابیں پڑھنے کی عادت نہیں رہی۔ غضب خدا کا، جہاں ملک میں کروڑوں اردو کے لکھنے پڑھنے والے موجود ہیں، وہاں اچھی سے اچھی کتاب پانچ سو سے زیادہ نہیں چھپتی، اور وہ بھی دس برس

تک ناشر کے ہاں پڑی رہتی ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ لوگ کتنی کتابیں پڑھتے ہیں۔

رہا زبان سننے کا! تو جب ٹھیک زبان بولنے والے ہی نہ رہے، تو کسی کے ساتھ بات چیت کرنے سے آپ صحیح زبان سیکھ سکتے ہیں!

نتیجہ بھی ظاہر ہے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ان حالات میں اگر کوئی شخص ٹھیک زبان بولنے اور لکھنے اور سکھانے کا اہل ہے، تو بسا غنیمت ہے۔ میرے نزدیک فرمان فتح پوری ایسے ہی شخص ہیں۔

فالحمدللہ

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

بچپن اور لڑکپن کی کچھ یادیں

میرا بچپن، میرے دوسرے بھائی بہنوں کی بہ نسبت زیادہ لاڈ پیار میں گزرا۔ وجہ یہ تھی کہ میں، ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ والد صاحب جنھیں میں ابا جی کہتا تھا پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ میں دو تین برس کا تھا کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، اپنے آبائی گاؤں میں آگئے تھے اور نیا گھر بنوا کر مستقلاً رہنے لگے تھے۔

ابا جی، فارسی اور اردو کے ساتھ ہندی بھی اچھی جانتے تھے۔ خاص طور پر فارسی سے انھیں گہری دلچسپی تھی گلستاں، بوستاں اور کریما کے بیشتر اجزا ان کو زبانی یاد تھے۔ مولود شریف کی محفلوں میں وہ مولانا روم کی مثنوی بھی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بھی فارسی کے بہت سے اشعار اور مقولے بچپن ہی میں ازبر ہو گئے۔ چار یا پانچ سال کی عمر سے وہ مجھے قرآنی آیات بھی زبانی یاد کرانے لگے تھے۔ چناں چہ میں نے ۷ سال کی عمر میں ناظرہ ختم کرکے کچھ پارے حفظ کر لیے تھے۔

گھر میں دو توتے، ایک بندر، دو تین دودھ دینے والی بکریاں، ایک گائے، ایک بھینس اور ایک مینڈھا پلا ہوا تھا۔ میں انھیں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا کہ میری عمر کا کوئی دوسرا بچہ، گھر میں نہ تھا۔ بندر کے رہنے کے لیے گھر کے صحن میں ایک اونچا بانس گڑا ہوا تھا جس کے اوپر ایک مچان سا بنا دیا گیا تھا۔ بندر ڈھیلی زنجیر سے اس طرح بندھا رہتا تھا کہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتا جاتا رہتا تھا۔ اگر کبھی زنجیر کی قید سے نکل بھاگتا تو اچھل کود سے سارے گاؤں کو پریشان کر دیتا تھا اور مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ مینڈھا چھوٹے قد کا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سفید نرم بال مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کے سر پر اندر کو مڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی دو سینگیں بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ سینگیں بظاہر بے خطر تھیں لیکن جب مینڈھا کسی کو سر مارنے پر آتا تھا تو جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ مجھ پر اس نے ایک بار بہت خطرناک حملہ کیا تھا لیکن میں نے شور مچایا تو ایک ہلواہے نے مجھے بچا لیا۔

گھر کا یہ ماحول بہت دنوں قایم نہ رہ سکا۔ ۱۹۳۲ء میں جب کہ میری عمر صرف سات سال کی تھی ابا جی ہم سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئے۔ ان کی اچانک وفات کی وجہ مجھے یہ بتائی گئی کہ میرے سب سے بڑے بھائی ہیضے کی وبا کا شکار ہو کر یکایک عین جوانی میں انتقال کر گئے اور یہ صدمہ میرے ابا جی زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے

ابا جی کی وفات کے بعد گھر کا شیرازہ بہت جلد بکھر گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابا جی کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ہمارا گھر ان کے دوستوں اور عزیزوں کے لیے ایک طرح کا مہمان خانہ بنا رہتا تھا۔ گھر کے اخراجات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ نقدی اثاثہ ابا جی کی زندگی ہی میں تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ زمینداری تھی لیکن ڈھنگ سے زندگی گزارنے کے لیے کافی نہ تھی۔

ابا جی کے انتقال کے تین سال بعد میری بڑی بہن بھی تقریباً جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ ان کی اور ان کے تین بچوں کی پرورش بھی میرے بڑے بھائی اور والدہ کو کرنی پڑی، میری والدہ جنھیں ہم بی بی کہتے تھے اپنے خاندان کی سب سے سیدھی سادی شریف خاتون سمجھی جاتی تھیں۔ نہ کبھی کسی کی برائی میں منھ کھولا اور نہ کسی کا کبھی کوئی احسان

لیا۔ اباجی کی زندگی میں مالی اعتبار سے ہمارے گھر کا جو بھرم قایم ہو گیا تھا اس سے عمر بھر برقرار رکھا۔ تلخی ترشی کے زمانے میں بھی انھوں نے کبھی کسی سے قرض نہیں لیا بلکہ جو لوگ ہمارے گھر سے قرض لینے کے عادی ہو گئے تھے، انھیں وہ اپنی تنگدستی کے باوجود، کچھ نہ کچھ دیدیا کرتی تھیں۔ بڑی بہن اور بڑے بھائی ایسا کرنے سے منع کرتے تو سمجھا کر کہتی تھیں ممکن ہے یہ لوگ ہم سے بھی زیادہ ضرورت مند ہوں دوسرے یہ کہ ان کی ضرورت پوری کرنے سے ہمارے گھر کی لاج باقی رہتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لوگ ہمیں پہلے کی طرح آج بھی بہت خوشحال سمجھتے ہیں۔ اگر ان پر یہ راز کھل جائے کہ اب ہم کسی کو کچھ دینے کے لایق نہیں رہے تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ خواہ مخواہ لوگ ہم پر ہنسیں گے اور ہمیں حقیر جانیں گے۔ اب غور کرتا ہوں تو ان کی یہ باتیں شیخ سعدی کے اس قول کے عین مطابق نظر آتی ہیں کہ اپنی تنگدستی یا کمزوری کا اظہار دوسروں پر کرنا ہم چشموں اور ہمسایوں سے اپنا مذاق اڑوانا ہے۔

والدہ محترمہ کی اس تربیت نے مجھ میں اور بڑے بھائی میں غیرت اور خودداری کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ خراب سے خراب حالات میں بھی ہم نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور پوری دیانت اور محنت کے ساتھ حالات کو سدھارنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس کوشش میں بڑے بھائی کو تعلیم چھوڑنی پڑی لیکن ان کی یہی قربانی میرے لیے تعلیم جاری رکھنے کا وسیلہ بن گئی۔ چناں چہ انھوں نے مجھے تقریباً سات سال کی عمر میں، یعنی اباجی کی وفات کے فوراً بعد ۱۹۳۳ء میں پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا۔

چوتھی جماعت کا امتحان وظیفے کے ساتھ پاس کر کے میں مڈل اسکول میں داخل ہوا۔ مڈل کے امتحان میں پورے ضلعے میں اوّل آیا اور پہلے دو سال چھ روپے پھر آٹھ روپے مہینے کا سرکاری وظیفہ ملنے لگا۔ اس طرح میرے لیے ہائی اسکول میں داخلہ لینے اور تعلیم کو جاری رکھنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن میرے خیال میں بچپن کا زمانہ پرائمری اسکول پر اور لڑکپن مڈل اسکول پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کی زندگی کو بچپن یا لڑکپن کا نام دینا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے میں صرف اسی دور تک کی جو باتیں مجھے یاد ہیں وہی بیان کروں گا۔

بچپن کے تعلق سے پانچ سال کی عمر تک جو واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں ان میں ایک تو ۳۱-۱۹۳۲ء میں کانپور کا ہندو مسلم فساد ہے۔ میں اباجی کے ساتھ پہلی بار کانپور گیا تھا۔ حمزہ بابو کی کوٹھی کے قریب ہیرامن کے پورہ میں رہتا تھا۔ حالاں کہ میرے گھر کے آس پاس مسلمانوں کی اکثریت تھی، پھر بھی پورا محلہ خوف زدہ سا رہتا تھا۔ شہر میں جس انداز میں لوٹ مار ہو رہی تھی اسے دیکھ کر میں بھی سہما سہما رہتا تھا۔ چناں چہ ضد کر کے بہت جلد والدہ کے پاس گھر واپس آ گیا تھا۔

ایک اور واقعہ مار پٹائی کے حوالے سے یاد آ رہا ہے۔ میرا گاؤں، دریائے گنگا کے کنارے، واقع تھا۔ اباجی، شادی کی ایک دعوت میں گنگا کے اُس پار، پریاں واں نامی قصبے جا رہے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ میں شادی میں جانے کے لیے ضد کر رہا تھا۔ اباجی نے پہلے تو سمجھایا بجھایا، پھر تھانیداری والے دو تین بید رسید کیے۔ میں چیختا چلاتا گھر واپس پہنچا اور والدہ کی گود میں بہت دیر تک سسکتا رہا۔

مجھے فارسی کے متعدد اشعار خصوصاً نعتیہ اشعار اور کریما و گلستاں و بوستاں کے بہت سے ٹکڑے چھ سات سال کی عمر میں زبانی یاد ہو گئے تھے۔ یہ اباجی کے ساتھ ہر وقت رہنے کا فیضان تھا۔ اباجی مجھے زیادہ سے زیادہ اشعار، زبانی یاد کرانا چاہتے تھے اور میں بھی پوری دلچسپی لیتا تھا۔ چناں چہ میں نے اپنی کتاب "اردو کی نعتیہ شاعری" کے مقدمے میں فارسی کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ عموماً بچپن ہی کی یادوں کا سرمایہ ہیں۔ چھ

سات سال کی عمر کا ایک اور واقعہ پوری وضاحت کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہے یہ واقعہ، مذہبی نوعیت کا تھا اور جس عمر میں یہ میرے مشاہدے میں آیا۔ شاید وہ عمر نفسیاتی اعتبار سے اس قسم کے مذہبی واقعات کو، دل و دماغ میں طاری کر لینے کی مناسب ترین عمر ہوتی ہے۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ میں اس جگہ جو واقعہ بیان کر رہا ہوں، وہ میری عمر کے بہت سے ذہنوں میں محفوظ ہوگا وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ مختصر نہیں اپنے وقوع میں بہت طویل ہے اور شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی مشہور گرانڈ ٹرنک روڈ کے تعلق سے پاک و ہند کے طویل علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔

۳۳-۱۹۳۲ء کی بات ہے سہسرام (صوبہ بہار) کے ایک درویش صفت مسلمان نے زیارتِ بیت اللہ کی غرض سے پیدل چل کر مکّہ مکرمہ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ بیت اللہ کے اس پیادہ مسافر کا نام سبحان احمد تھا۔ سفر کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر پانچ قدم پر دو رکعت نفل پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے ایک میل کا سفر گھنٹوں میں طے پاتا تھا۔ جس علاقے سے گزرتے، ان کو دیکھنے، ان سے مصافحہ کرنے، ان کی دست بوسی اور گل پاشی کے لیے دُور دور سے ہزاروں مسلمان، گرانڈ ٹرنک روڈ کے کنارے صف بستہ ہو جاتے تھے۔ ان میں عام و خاص ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے اور جگہ جگہ اس سلسلے میں استقبالیہ جلسے منعقد کیے جاتے تھے۔ چناں چہ جب وہ ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرے تو دوسروں کے ساتھ میں بھی کئی میل تک ان کے ساتھ گیا۔ بڑے بھائی نے ان کی شان میں ایک نظم کہی۔ نوح ناروی کے ایک مشہور شاگرد اور صوفی بزرگ جناب عبدالرؤف رسوا، ان دنوں ہمارے ہاں مقیم تھے۔ انھوں نے سبحان احمد صاحب کی مدح میں متعدد نظمیں کہیں۔ ان کے شاگردوں میں میرے چچا سید صدیق حسن اور محمد بسور گونتی کے حافظ عبدالغفور تاج نے بھی قصاید لکھے۔ یہ ساری چیزیں الگ الگ پمفلٹ کی شکل میں شایع کی گئی تھیں ان میں سے بعض مطبوعہ صورت میں آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔

اب جب کبھی، سبحان احمد صاحب مجھے یاد آتے ہیں تو سوچا کرتا ہوں کہ جب سفر کے لیے آسان ذرائع موجود تھے اور سبحان احمد صاحب سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی حیثیت بھی رکھتے تھے تو آخر پیدل چل کر اور وہ بھی ہر دو قدم پر دو رکعت نفل پڑھتے ہوئے، حج کرنے کا ارادہ کیوں کیا؟ مجھے معلوم نہیں وہ مکّہ مکرمہ تک پہنچے یا نہیں پہنچے۔ پہنچے بھی تو کب، کتنی مدّت میں اور کس طرح واپس ہوئے۔ سہسرام (بہار) کے بہت سے لوگ پاکستان میں موجود ہیں انھیں ان کا حسب نسب ضرور معلوم ہوگا اور وہ شاید اس سے بھی باخبر ہوں گے کہ آخر آخر بیت اللہ کے اس مسافر پر کیا گزری؟ بہر حال چوں کہ اپنی نوعیت کا یہ ایک عجیب واقعہ تھا۔ اور میرے لیے حیران کن بھی اس لیے ذہن میں اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ آج تک ہر بات پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ اب بھی اگر کسی صاحب کو سبحان احمد کے بارے میں واقعی علم ہو اور وہ اس کی تفصیلات بتا سکیں تو شاید ان کی داستان بڑی دل چسپ ہوگی۔

گاؤں اور قصبے کی زندگی بھی عجیب و غریب زندگی ہوتی ہے۔ بارش، سردی اور گرمی کے موسموں کا اثر وہاں کے باشندوں میں دیر تک بھیگنا، دوسروں پر پانی پھینکنا، مچھلیاں پکڑنا، جھولے ڈالنا، پینگیں بڑھانا، اونچے درختوں پر چڑھ کر آم اور جامن توڑنا، میلوں ٹھیلوں اور دنگلوں میں جانا اور ان میں خرچ کرنے کے لیے ضد کر کے امّی ابو سے پیسے لینا بھی، امیر و غریب ہر گھر کے بچّے کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ ساری باتیں بچوں کے کھیل کود اور تفریح کا حصہ ہوتی تھیں۔ سردی میں صبح سویرے بٹیر کے شکار کے لیے ٹولیاں بنا کر نکلنا، شام کو الاؤ لگانا، اس کے ارد گرد بیٹھ کر رات گئے تک آگ تاپنا، کہانیاں سننا اور سنانا، جنگ نامہ اور شاہنامہ ہندی کبھی زبانی کبھی پڑھ کر۔ لاپنا، نوٹنکی اور اتائیوں کا تماشا دیکھنے کے لیے دور دراز کا سفر کر کے پیدل جانا، تل کے لڈو اور باجرے کے آٹے کی ٹکیاں ذوق و شوق سے پکوانا، خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا بھی عام تھا۔ ہر گھر کے لڑکے بچے، بڑوں کے ساتھ ان مشغلوں میں کسی نہ کسی طور پر شریک رہتے تھے۔

گرمی کے موسم میں کبھی مکان کی چھت پر، کبھی گھر کے باہر میدان میں اور کبھی کھیت کھلیان میں بھی سلائی ہوتی تھی۔ تربوز خربوزے، ککڑی اور مونگ پھلی کے کھیتوں میں سونا یوں ضروری تھا کہ اس کے بغیر فصلیں گیدڑوں سے محفوظ نہ رہ سکتی تھیں۔ میرا بچپن اور لڑکپن دیہات کے ایسے ہی ماحول میں گزرا ہے اور میں نے اس ماحول کے سارے مشغلوں میں سے ہر ایک میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ ان میں ایک دو واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ اب تک مجھے یاد ہیں اور شاید عمر بھر یاد رہیں گے۔

ابا جی کی وفات کے بعد میرے دو چچا، کلکتے کی تجارتی شپ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے اور عموماً یورپ، امریکہ اور جاپان کے سفر میں رہتے تھے۔ سال دو سال میں واپس آتے تھے اور جب ہمیں وہاں کی ترقی یافتہ زندگی کی تفصیل بتلاتے تھے تو ہم بڑی حیرت سے، اسے کہانی سمجھ کر سنتے تھے۔ البتہ ایک چچا جن کا ڈیل ڈول دیکھنے کے لایق تھا، مستقلاً گاؤں میں رہتے تھے اور اپنے چاروں بھائیوں کے گھر کا انتظام وہی دیکھتے تھے۔ گویا، وہ سارے خاندان کے بچوں اور لڑکوں کے مقامی گارجین یا سرپرست تھے، ندی اور تالاب میں نہانے اور جامن اور آم کے درختوں پر چڑھنے سے ہر لڑکے کو بہت سختی سے منع کرتے رہتے تھے اور اگر کوئی ایسا کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اس کی مرمت کرتے تھے۔ پھر بھی ہم اس کام سے باز نہ آتے تھے۔ جوں ہی پتا چلتا کہ وہ دوپہر میں سو رہے ہیں یا گاؤں سے باہر گئے ہیں یا کسی ایسے کام میں مصروف ہیں کہ تالاب اور باغ کا رخ نہ کریں گے تو ہم تالاب میں نہانے اور جامن یا آم توڑنے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ کبھی ضرورتاً اور بیشتر بے ضرورت درختوں پر چڑھ جاتے تھے۔ ایسا کرنے میں ایک دفعہ تو میں جامن کے پیڑ سے گرا اور ایک بار آم کے پیڑ سے۔ آم کے پیڑ سے گرنے میں یہ ہوا کہ میرا دایاں ہاتھ کاندھے کے پاس سے اکھڑ گیا۔ بدن کے اکثر حصوں میں سخت چوٹ آئی تھی لیکن ہاتھ کا معاملہ بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ درد بہت شدید تھا اور ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ والدہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے چچا کو اطلاع کرائی اور میری دیکھ بھال کے لیے بھیجا۔ چچا جان غصے میں بھرے ہوئے آئے، نہ میرا حال پوچھا نہ میری حالت دیکھی، دو تین ہاتھ رسید کیے اور جس ہاتھ میں چوٹ آئی تھی اسی کو پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور یہ کہنے لگے "میں نے منع کیا تھا کہ پیڑ پر مت چڑھنا، اب بھگتو"، یعنی انھوں نے مجھے تسلی دینے یا میرا حال معلوم کرنے کے بجائے میری مزید مرمت کر دی۔ پھر بھی ان کا یہ عمل اتفاق سے میرے لیے فایدہ مند ثابت ہوا۔ جس ہاتھ کی ہڈی، شانے کے پاس سے اکھڑ گئی تھی یعنی جگہ سے بے جگہ ہو گئی تھی وہ ان کے جھٹکوں اور مار کٹائی سے خود بخود اپنی جگہ پر آ گئی اور اس طرح مجھے ہاتھ کے ناقابل برداشت درد سے بہت جلد نجات مل گئی۔

یہی چچا جو سارے خاندان کے بچوں کے نگراں تھے ایک بار اور میری مصیبت میں کام آئے۔ ہوا یہ کہ مجھے دو تین پیسے بازار سے گنا خریدنے کے لیے امی سے ملے تھے۔ یہ پیسے تانبے کے تھے اور ان پر انگلستان کے جارج پنجم کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں ان پیسوں سے کھیل رہا تھا اور جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے انھیں بار بار منھ میں ڈال

رہا تھا۔ ایک پیسہ اچانک میرے حلق کے اندر چلا گیا اور اس میں پھنس گیا۔ میں گھگیانے لگا، آنکھیں باہر نکل آئیں اور یوں لگتا تھا جیسے اب جان سے گیا۔ چچا نے پہلے تو میری گردن اور گدی پر تیزی سے دو تین ردے لگائے۔ اس پر بھی پیسہ حلق سے پیٹ کے اندر نہ گیا تو انھوں نے مجھے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور کئی فٹ کی بلندی سے پیروں کے بل چھوڑ دیا۔ یہ عمل انھوں نے دو تین بار کیا اور ایسا کر کے پیسہ پیٹ کے اندر چلا گیا۔ تماشا دیکھنے والوں نے اس طرح میری جان بچانے پر چچا کی ذہانت اور محبت دونوں کی داد دی۔

بچپن کا ایک اور واقعہ مجھے نہیں بھول سکتا۔ ابا جی ابھی حیات تھے اور میری عمر سات سال سے زیادہ نہ تھی ایک دن پیٹ میں بہت زور کا درد اٹھا اور بڑھتا ہی چلا گیا، میرے ایک چچا، طبیب بھی تھے۔ انھوں نے بدل بدل کر کئی دوائیں دیں لیکن فائدہ نہ ہوا۔ باہر سے طبیب بلائے گئے، ان کی دوائیں بھی کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ بے چینی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے بڑے بھائی، بڑی بہن، ابا جی اور امی باری باری سے مجھے گود میں لے کر اپنے سینے سے رات دن لپٹائے رہتے۔ ذرا دیر کو نیند سی آجاتی لیکن آنکھ کھلتے ہی تڑپنے لگتا۔ کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ کس چیز کا اور کس قسم کا درد ہے۔ آخر کار طبیبوں نے جواب دے دیا۔ میں روز بروز نڈھال ہوتا گیا اور ہفتے کے اندر میری حالت یہ ہو گئی کہ لوگ میری زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے۔

میری مشکل آسان کرنے کے لیے اللہ سے وہ دعائیں مانگی جانے لگیں۔ جو زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا بیمار کے لیے۔ بہت سادہ اور ہلکی پھلکی غذا کبھی کبھی دی جاتی تھی۔ حالاں کہ میں مختلف قسم کے کھانے اور پھل وغیرہ رو رو کر مانگا کرتا تھا لیکن اس ڈر سے کہ کہیں درد اور نہ بڑھ جائے مجھے پتلی دال اور دلیا کے سوا کوئی چیز نہ دی جاتی تھی۔

جب میرے جینے کی آس نہ رہی تو آخر میں طبیبوں اور عزیزوں نے اجازت دے دی کہ جو چیز کھانے کے لیے مانگیں دے دی جائے یعنی موت سے پہلے ہر قسم کی خواہش پوری کر دی جائے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا کھاؤ گے۔ میں نے کہا کھیرا۔ کھیرے کا نام یوں لیا کہ کھیرے کی فصل تھی اور جب دوسرے بچے کھیرا کھاتے نظر آتے تو مجھے بڑی لالچ آتی تھی اور اندر سے کھیرا کھانے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہوتی تھی میری آخری خواہش کا لحاظ رکھ کر مجھے ہرے کنچن تازہ اور ملائم کھیرے کی چند قاشیں دیدی گئیں۔ میں نے جیسے ہی کھایا مجھے ایک طرح کا سکون محسوس ہوا میں نے مزید کھیرا طلب کیا، میرے سامنے بہت سے کھیرے کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔ خدا کا کرنا دیکھو کہ جیسے جیسے میں کھیرے کھاتا گیا مجھے افاقہ ہوتا گیا۔ تھوڑی دیر میں میرے پیٹ کا درد غائب ہو گیا اور سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کھیرے کی یہ کرامت، کھیرا کھاتے وقت مجھے آج بھی یاد آجاتی ہے۔ بعد میں طبیبوں سے معلوم ہوا کھیرے اور کھیرے کے بیج، پیٹ کی بہت سی بیماریوں کے لیے بہت مفید ہیں۔

ہر چند کہ میرا گاؤں دریائے گنگا کے کنارے واقع تھا اور برسات کے موسم میں تین چار مہینے بارش کا ایسا زور دار سلسلہ رہتا تھا کہ ندی نالے اور تالاب امنڈ پڑتے تھے۔ ایسے میں گاؤں کے سبھی لوگ پیراکی سے خوب واقف ہوتے تھے لیکن مجھے پوری طرح پیرنا نہ آیا۔ چناں چہ ایک دفعہ ایک ندی میں دور تک بہہ گیا تھا۔ اگر ندی کے کنارے کے ایک پیڑ کی جڑ میرے ہاتھ نہ آجاتی اور میرے چچازاد بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے مجھے نہ کھینچ لیتے تو میرا خاتمہ ہو گیا تھا۔ پیراکی سے ناواقفیت یا گہرے پانی سے ڈرنے کا ایک نفسیاتی سبب بھی تھا۔

میرے گھر کے بالکل سامنے اور قریب ہی ایک پختہ کنواں تھا سارا گاؤں اسی سے پینے کا پانی حاصل کرتا تھا۔ پانی خاص گہرائی میں تھا اور رسی میں ڈول، گھڑا یا بالٹی باندھ کر کھینچا جاتا تھا۔ کبھی کبھی رسی کے ٹوٹ جانے

یا ہاتھ سے ڈول اور بالٹی کے چھوٹ جانے سے پانی بھرنے والے کی جان جو کھم میں پڑ جاتی تھی چناں چہ خدا بخش نامی ایک ندّاف کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا وہ کنویں میں گر گیا اور سارے گاؤں میں اس کی موت سے کہرام مچ گیا۔ لاش میرے سامنے نکالی گئی۔ میری عمر اس وقت چار پانچ سال کی تھی اس واقعے کا خوف ایسا سمایا کہ گہرے پانی سے ہمیشہ ڈرتا رہا اور شاید اسی لیے ماحول کی سازگاری کے باوجود مجھے اور تو بہت کچھ آگیا، پیراکی کا فن نہ آیا۔

میرے گاؤں اور آس پاس کے علاقوں میں بلکہ فتح پور، کانپور، الہ آباد، رائے بریلی، اُناؤ اور پرتاپ گڑھ یعنی اودھ کے اکثر اضلاع اور قصبات کے مسلمانوں میں، حفظِ قرآن، شاعری، پہلوانی اور بنوٹ بازی کے مشاغل خاص طور پر مقبول تھے چناں چہ میرا بچپن اور لڑکپن بھی اسی ماحول میں گزرا۔ ہر مشغلے سے تھوڑی بہت دلچسپی رہی۔ شعر بہت کم عمری سے یعنی چوتھی پانچویں جماعت سے کہنے لگا تھا۔ چناں چہ فتح پور کے مشہور قصبہ ہتگام میں جس کے تعلق سے نشتر ہتگامی اور اقبال ورما ہتگامی شہرت رکھتے ہیں، ضلع بھر کے اسکولوں کا ایک ٹورنامنٹ ہوا۔ اس میں کھیل کود کے ساتھ مشاعرے کا بھی اہتمام تھا۔ ہتگام میں بندر بکثرت تھے اور ہر آدمی کو ان کے حملوں سے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ میں نے اس بات کو سامنے رکھ کر کچھ اشعار کہے تھے۔ ان اشعار میں یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا اور مجھے پہلا انعام ملا تھا۔

واہ واہ کیا قصبۂ ہتگام ہے
بندروں کا یاں ہجوم عام ہے

بنوٹ بازی یعنی لکڑی سے مار کرنے اور دوسروں کے وار سے بچنے کے فن سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ قصبات اور شہر، دونوں کی زندگی میں اس وقت اس کی سخت ضرورت رہتی تھی

فسادات میں قرولیاں، گپتیاں اور چھری چاقو تو بعد میں نکلتے تھے، پہلے لاٹھیوں اور ڈنڈوں ہی سے کام لیا جاتا تھا زمینداری اور زمیندار ہونے کا بھرم رکھنے کے لیے بھی اس کی ضرورت ہر وقت رہتی تھی کھیت کھلیان کے جھگڑوں کو طے کرنے، جانوروں کے چوری ہو جانے اور کشتی کے دنگلوں کے سلسلے میں تو لٹھ کا چل جانا عام بات تھی۔

بچپن اور لڑکپن میں مجھے کشتی اور لکڑی کے فن سے دلچسپی اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ میرے دو حقیقی چچا اور کئی چچازاد بھائی ان میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی لٹھ بازی اور کشتی کے کئی مقابلے اور مظاہرے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے انھیں کی ہمت افزائی سے مجھ میں بھی کشتی اور لکڑی کا شوق پیدا ہوا۔ مڈل اسکول میں حساب کے استاد منشی چھب لال سنگھ کو ورزش اور کشتی سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے اسکول کے احاطے میں ایک اکھاڑا بنا رکھا تھا اور صبح تڑکے اٹھ کر ڈنڈ بیٹھک شروع کر دیتے تھے۔ ہاسٹل کے ہندو طلبہ کو بھی انھوں نے ورزش کا عادی بنا دیا تھا۔ میں بھی ہاسٹل میں رہتا تھا اس لیے میں نے بھی وہاں کے ماحول کا اثر قبول کیا۔ چناں چہ ہم جماعتوں کے ساتھ زور آزمائی ہو جاتی تھی۔

منشی چھب لال سنگھ کشتی کے دنگلوں میں بھی اپنے شاگردوں کو لے جاتے تھے۔ ایک دنگل میں میرا مقابلہ انھوں نے ایک کھتری ذات کے ہندو جاٹ سے کرا دیا۔ جاٹ سے پنجہ ملانے کے ساتھ ہی میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ طاقت میں کسی طرح مجھ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ اس لیے طاقت کے بجائے داؤ پیچ ہی سے کام چل سکتا ہے لیکن داؤ لگانا بھی آسان نہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں پوری قوت کے

ساتھ پنجے دے رکھے تھے اور پیشانی سے پیشانی ملا رکھی تھی۔ میری کوشش یہ تھی کہ جاٹ ذرا ڈھیلا پڑے تو میں گرون جھکا کر اس کی ٹھوڑی پر سر سے حملہ کروں لیکن شاید وہ بھی اسی تاک میں تھا اس لیے ایسا کرنے کا موقع نہ ملا۔ ہم دونوں پندرہ بیس منٹ تک اتنی قوت اور شدّت سے ایک دوسرے کی پیشانی رگڑتے رہے کہ خون بہ نکلا آخر کار ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ہمارا مقابلہ برابر قرار دے دیا گیا۔ گویا جان بچی لاکھوں پائے۔

میرا یہ مشغلہ بہت دنوں قایم رہا اور ہائی اسکول کی طالبعلمی کے زمانے میں جہاں میں نے بیت بازی اور فی البدیہہ مباحثے کے درجنوں مقابلے جیتے اور مولانا حسرت موہانی و جگر مرادآبادی جیسے بڑے شاعروں کے ہاتھ سے انعامات حاصل کیے وہیں میں نے فتح پور کے ضلعی ٹورنامنٹ میں کشتی کا پہلا انعام بھی ضلع کے کلکٹر جناب زاہد حسین صاحب کے ہاتھوں وصول کیا۔ یہ وہی زاہد حسین تھے جو بعد کو پاکستان میں اسٹیٹ کے پہلے گورنر مقرر ہوئے۔

ابتدائی شاعری کے ایک دو واقعات اور یاد ہیں۔ پرائمری اور مڈل اسکول میں بلکہ اپنے گاؤں اور قصبے میں لڑکوں اور طالب علموں کے درمیان مختلف وجوہ سے گروہ بندی رہتی تھی۔ اس گروہ بندی کے نتیجے میں کسی خاص لڑکے کا بائیکاٹ کر دیا جاتا تھا۔ یعنی اس کے ساتھ بول چال بند رہتی تھی اور اس پر طرح طرح سے فقرے اور آوازے کسے جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر میں شاعری سے بھی کام لیتا تھا۔ چناں چہ رماشنکر نام کے ایک ہندو لڑکے کے بائیکاٹ پر میں نے یہ شعر کہا۔

ایک لڑکا گاؤں کا عرصے سے بائیکاٹ ہے
نام اس کا "ر" سے ہے چغلی میں موٹر کاٹ ہے

موٹر کاٹ سے مراد موٹر کار تھی۔ اس شعر کے حرف "ر" کو کسی اور حرف سے بدل کر ضرورت کے مطابق کسی دوسرے طالب علم کے لیے بھی موزوں کر لیا جاتا تھا۔

چھٹی جماعت کا ایک اور اہم واقعہ یاد آگیا اور یہ شاید میرے لڑکپن کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ پرائمری اسکول سے مڈل اسکول تک، میرے دو چچازاد بھائی بھی میرے ہم جماعت رہے۔ ان میں ایک سیّد فرمان علی تھے جن سے میری پکّی دوستی تھی اتنی پکّی کہ ہم لوگوں نے جب سے ہوش سنبھالا تقریباً ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ مڈل اسکول گھر سے پانچ چھے میل کے فاصلے پر تھا، میرے پاس سائیکل تھی ہم دونوں اسی پر جاتے تھے۔

ایک دن صبح سویرے جب میں فرمان کے دروازے پر پہنچا اور اسکول چلنے کے لیے آواز دی تو چچی جان نے بتایا۔

> "ابھی وہ بڑے تالاب سے نہا کر آئے تھے بہت تیز بخار چڑھ گیا ہے۔ بخار اتر گیا تو وہ کسی کے ساتھ آجائیں گے، تم جاؤ ماسٹر صاحب سے حال بتا دینا اور فرمان نہ پہنچیں تو چھٹی کی درخوست لگا دینا"

مجھے اسکول پہنچے ہوئے مشکل سے دو گھنٹے گزرے تھے کہ گاؤں کا ایک پاسی ہانپتا کانپتا یہ منحوس خبر لایا کہ فرمان میاں کا انتقال ہو گیا۔ اس اچانک خبر سے سارے عزیزوں اور دوستوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ فرمان میرے عزیز ترین دوست تھے۔ لنگوٹیا یار تھے۔ بچپن ہی سے ہر جگہ اور ہر دکھ سکھ میں ہم دونوں ساتھ رہتے تھے۔ میرے لیے ان کی وفات بڑی جان لیوا تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ الٹی سیدھی شاعری تو کر ہی لیتا تھا۔ اس لیے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایک نظم بھی کہی تھی لیکن اب یاد نہیں رہی۔ البتہ میں نے یہ کیا کہ اپنے نام کے ساتھ ان

کے نام کو تخلّص کے طور پر لگا لیا۔ گویا میرا تخلص فرمان ہو گیا۔ اچھے بُرے جتنے بھی اشعار کہتا تھا۔ سب میں "فرمان" کو بطور تخلص استعمال کر کے دل خوش کرتا تھا۔ پھر مضامین وغیرہ میں بھی اسی نام کو استعمال کرنے لگا۔ ۱۹۴۸ء میں یہ واقعہ آیا تھا اُس وقت سے "فرمان" میرے نام کا جزو بن گیا۔ لوگ میرا اصل نام بھول گئے اور سب اسی نام سے پکارنے لگے۔ میں خوش ہوں کہ میرے ساتھ ساتھ میرا دوست بھی زندہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے اب صرف وہی زندہ ہے۔ میرا نام تو کوئی جانتا بھی نہیں۔

یہ باتیں تیرہ/ چودہ سال کی عمر تک کی ہیں میرا خیال ہے اس کے بعد بچپن اور لڑکپن دونوں کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور آدمی جوانی یا نوجوانی کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

رشید حسن خاں

ڈاکٹر فرمان فتحپوری — چند تاثرات

فرمان صاحب کی شخصیت میں کئی خوبیاں ایسی ہیں جن پر رشک کیا جا سکتا ہے اور ان کے علمی کاموں میں کئی خصوصیتیں ایسی ہیں جو نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں دل آویزی کتنی اور کیسی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو بھی اُن سے آزردہ نہیں پایا (یا یوں کہیے کہ اظہارِ رنجیدگی کرتے ہوئے نہیں پایا) جن کی اس صلاحیت میں کسی کو شک نہیں اور جس کا اظہار بے محابا ہوتا رہتا ہے۔

علمی اور مجلسی معاملات میں ایسے کئی مواقع آئے ہوں گے، اور ضرور آئے ہوں گے، جب بعض باصلاحیت معاصرین کو بہ خیالِ خویش رنجشِ بجا کی گنجایش کا شدید احساس ہوا ہوگا۔ ایسے ایک معاملے سے میں بھی واقف ہوں اور اچھی طرح۔ یہ وہ موقع تھا جب فرمان صاحب کو، اردو لغت کی تالیف کے سلسلے میں، اُس ادارے کی سربراہی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب بھی اِس سربراہی کے متمنّی تھے، جن کو علمی دنیا میں بھی شہرت حاصل تھی اور غیر علمی معاملات میں بھی جن کی صلاحیتوں کے سبھی معترف تھے۔ اپنے مقابلے میں آنے والوں کو وہ بخشنے کے قائل نہیں تھے اور اِس سلسلے میں تکلّف کے ذرا بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔ میں نے ان کو بھی فرمان صاحب کی ویسی مخالفت کرتے ہوئے نہیں پایا، جس کی توقع تھی اور جس کا وہ حق ادا کر سکتے تھے۔

وضع داری ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم لغت میں بھی صحیح طور پر درج کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ہماری زندگی میں تو وہ "بے گانہ آشنا" بن کر رہ ہی گیا ہے۔ اِس میں حالات کے جبر کو بھی دخل ہے اور کم ظرفی کو بھی۔ یہ تو ممکن ہے کہ لغت نویس کی حیثیت سے اِس لفظ کی وسعتِ مفہوم کو وہ لفظوں میں وہ اسیر نہ کر پائیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُن کی شخصیت اس لفظ کی قدِ آدم آئینہ دار ہے۔ اس کی کارفرمائی اُن کے مزاج کا جز اور طبیعت کا تقاضا ہے۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوشش کر کے بھی اپنے آپ کو اِس کے تقاضوں سے بے تعلق رکھنے پر قابو یافتہ نہیں ہو پائیں گے۔ عادت ہو تو بدل جائے فطرت کو کون بدل سکتا ہے۔

دُنیاوی معاملات میں صلح پسندی، رواداری اور تحمل کا حق ادا کرنے میں وہ بُخل سے کام نہیں لیتے، ناگزیر حالات میں مفاہمت اور مصالحت سے بھی دریغ نہیں کرتے؛ لیکن علمی مسائل میں وہ تکلّف کی آرایش کے بغیر بات کرتے ہیں اور اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں؛ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سلسلے میں قلم کو تلوار بنا لینا ضروری نہیں سمجھتے۔ ایسے مواقع پر وہ شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کے مقابلے میں عرشی صاحب کی روایت پر عمل کرتے ہیں۔ وہ غالب کو بہت مانتے ہیں، مگر اِس سلسلے میں غالب کے اِس مصرعے کی معنویّت کو منوانے پر اصرار نہیں کرتے کہ: وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دل کشا کہیے۔ وہ نشتر کی آب داری کو ترجیح دیتے ہیں اور عرفی کے اِس شعر کو پیشِ نظر رکھتے ہیں:

زشکوہ ہائے جفایت دو کون پُر شد لیک
ہنوز رنگِ ادب بر رُخِ سخن باقی است

تنقید اور تحقیق میں اُنھوں نے اپنے آپ کو کسی ایک دائرے کا قیدی بنانا پسند نہیں کیا؛ وہ کسی تحریک یا کسی

دبستان کا دائرہ ہو، یا کسی خاص موضوع کا۔ اِس سلسلے میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اِس آزادہ روی کو اپنا خاص انداز بنا لیتے ہیں، وہ اِس طرح اور اِس قدر گرم رفتار رہتے ہیں کہ کسی بھی موضوع میں کوئی خاص حیثیت حاصل نہیں کر پاتے۔ سب کچھ ہیں، لیکن بہت کچھ نہیں۔ وہ گویا باکمال صحافی ہیں کہ ہر وقت ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ بہ آسانی لکھ لیتے ہیں، مگر نقش ناتمام رہتے ہیں، گہرائی اور گیرائی، اِن دونوں کا حق ادا نہیں ہو پاتا، ہاں مشاقی اور آرائش پسندی کے بل پر سطحیت میں نظر فریب چمک ضرور شامل ہو جاتی ہے۔ فرمان صاحب کی تحریریں بہ طورِ عموم ایسی آرائش سے خالی ہیں۔ انھوں نے بہت سے موضوعات پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ موضوعات کا تنوع اُن کے مطالعے کی وسعت پر بھی گواہی دیتا ہے اور انھوں نے جس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اُس میں اُن کے اندازِ فکر کی گہرائی بھی نہ تشنہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اُس سے ہماری معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے۔

میں اُن کی بہت قدر کرتا ہوں، اور باتوں کے علاوہ اِس میں بہت کچھ دخل اِس بات کو بھی ہے کہ ادب کے مطالعے میں وہ مجہول قناعت پسندی کے قائل نہیں۔ ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ نیاز صاحب کی فرمایش پر انھوں نے رسالۂ نگار کا ایک خاص نمبر مرتب کیا تھا، تذکروں سے متعلق، یہ واقعی ناتمام کام تھا۔ اُن کی نظر سے یہ بات پنہاں نہیں تھی اور اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ناتمامی کی خلش کارفرما رہی۔ مناسب وقفے کے بعد انھوں نے اُس کو پھر سے مرتب کیا اور اِس بار اُسے کتابی صورت میں پیش کیا۔ جن لوگوں نے نگار کے اُس خاص نمبر اور اِس کتاب، دونوں کو پڑھا ہے، وہ بہ آسانی اور بہ خوبی بتا سکتے ہیں کہ دونوں میں اندھیرے اُجالے کا فرق ہے۔ اس خود احتسابی سے اب ہم میں سے بیش تر کا ربط ٹوٹتا جا رہا ہے۔

خود احتسابی کے لیے خود شناسی ضروری ہے۔ فرمان صاحب نیاز صاحب کے بعد سے، اُن کے معروف رسالے نگار کے باضابطہ ایڈیٹر ہیں۔ نگار کا ایک خاص انداز رہا ہے اور یہ انداز وہی تھا جو نیاز صاحب کا خاص انداز تھا۔ فرمان صاحب کو خوب معلوم تھا کہ وہ اُس انداز کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے نیاز صاب سے بالکل مختلف طبیعت پائی ہے۔ خود شناسی کی اِس صفت نے اُن کو نیاز صاحب کی تقلید کے راستے پر نہیں چلنے دیا۔ نگار پاکستان کی شکل و صورت اور معیار و مقصود وہ نہیں جو نگار کا تھا۔ شکل صورت تو وہی ہو سکتی تھی، لیکن جہاں تک معیار اور مقصود کا تعلق ہے، تو فرمان صاحب کوشش کرنے کے باوصف اُس کو واپس نہیں لا سکتے تھے، یوں کہ وہ نیاز صاحب کی طرح وسیع الذیل مقاصد کی نگہ داشت نہیں کر سکتے تھے۔ نیاز کے انداز کو کوئی ایسا ہی شخص اپنا سکتا تھا جو اُن کی جیسی صلاحیتوں کا مالک ہوتا اور علم و بصیرت کے ساتھ ساتھ گرمیِ بازار کا بھی قائل ہوتا۔ نیاز صاحب عمر بھر معرکہ آرائی میں مصروف رہے۔ سخن تراشی کے ساتھ ساتھ معرکہ آفرینی کی بھی بے پناہ صلاحیت اُن کے اندر تھی۔ وہ داغ کے الفاظ میں ایک نہ ایک فتنہ ساتھ لگائے رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

میں نے ایک بار دریافت کیا کہ مصطلحاتِ ٹھگی کا مطبوعہ نسخہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ خط کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ میرے رجسٹر یادداشت میں اِس کا حوالہ مندرج ہے۔ اس سے آپ اُن کے مطالعے اور اس سے متعلق یادداشتیں تیار کرنے کی باضابطگی کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اُن کے اِس طریقِ کار کا صحیح معنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے اُن کی اُس کتاب کو پڑھ کر، جو اردو ہندی تنازع کے موضوع پر ہے۔ بیش تر ضروری حوالے سلیقے کے ساتھ یک جا ملتے ہیں، جن سے تاریخی ترتیب کے ساتھ اِس مسئلے کا پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ طبیعت نظم و ضبط کی خوگر نہ ہو، تو ایسے

کام اِس خوش سلیقگی کے ساتھ نہیں ہو پاتے۔

ہمارے یہاں کیسے کیسے اساطینِ ادب گزرے ہیں۔ پچھلے زمانے کی بات چھوڑیے، ہمارے زمانے میں قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی دیو قامت شخصیتیں موجود تھیں، جن سے فیض پانے والوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔ یہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے کہ بعض لوگوں نے ان حضرات سے پوچھ پوچھ کر پوری پوری کتابیں لکھ لیں؛ لیکن ایسا ایک شخص بھی سامنے نہیں آیا جس نے عرشی صاحب یا صدیقی صاحب کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لیے کچھ کیا ہو۔ اِس کے مقابلے میں فرمان صاحب کو دیکھیے؛ انھوں نے نہ صرف یہ کہ نگار کو ایک دوسری شکل میں زندہ رکھا، اِس کا اہتمام بھی کیا کہ کراچی میں ہر سال نیاز صاحب کی یاد منائی جائے۔ ایک سیمینار ہو جس میں اربابِ ادب اور اہلِ نظر نیاز صاحب کی شخصیت اور اُن کے مختلف علمی و ادبی کارناموں پر اپنی رائے ظاہر کریں اور اس طرح یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حق ادا ہوتا رہے۔ اِس میں سب سے زیادہ کارفرمائی اُسی صفت کی ہے جس کو میں نے اوپر وضع داری کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ ایک کام ہی اُن کی شخصیت اور اُن کی طبیعت کے اُس رُخ کا آئینہ دار ہے۔

اُن کی ایک اور صفت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اُن کے اندازِ فکر کا ایک خاص رُخ سامنے آسکے گا۔ کراچی یونی ورسٹی میں وہ صدر شعبۂ اردو بھی رہے ہیں۔ گھٹیا پن اور جوڑ توڑ نے اِس منصبِ بلند کے وقار کو خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے ایسے لوگ اس کرسی پر آب بیٹھنے لگے ہیں کہ خفیف الحرکاتی کے ساتھ ساتھ جن کی جہالت کی بھی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ فرمان صاحب کا یہ زمانہ کیسا گزرا ہے، اس کا کچھ اندازہ اِس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایسے نئے اساتذہ کے تقرر کی کوشش کی اور کامیابی بھی حاصل کی، جن سے شعبے کی نیک نامی میں اضافہ ہوا اور یہ بھی دراصل نتیجہ تھا ان کی سلامتِ طبع اور بلند اندازِ نظر کا۔ میرے علم کی حد تک انھوں نے کوئی گروپ نہیں بنایا (خود کسی گروپ میں شامل رہے ہوں، تو اِس کا مجھے علم نہیں) اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شہرت اور ترقی کے لیے انھوں نے اپنے ذہن اور اپنے قلم پر بھروسا کیا اور سلامتیِ طبع کی رفاقت کو ناکافی نہیں سمجھا۔ اب یہ صفت کم یاب ہوتی جا رہی ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدائے پاک اُن کو زندہ و توانا رکھے اور اردو لغت کے جس مشکل ترین کام کی ذمّے داری کو انھوں نے قبول کیا ہے، اُس سے وہ بہ حُسن و خوبی عہدہ برآ ہو سکیں۔

کمال احمد صدیقی

ڈاکٹر فرمان فتحپوری — ایک تاثر

فرمائش ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ادبی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات لکھوں۔ اس کی تعمیل نہ صرف آسان ہے، بلکہ ایک نہایت خوش گوار فرض کی ادائیگی ہوئی۔ جی ہاں، فرض کی ادائیگی بھی، اور ایک قرض کی ادائیگی بھی۔ تنقید کے سلسلہ میں، چند واقعی ناقدین کو چھوڑ کر، ہماری زبان میں دو رجحان عام ہیں۔ ایک یہ کہ جب تک کسی کے بارے میں کوئی اہم ناقد نہ لکھے، دوسرے بھی نہیں لکھتے۔ چناں چہ سارا زور نفس مضمون پر نہیں بلکہ دوسرے کے نکتے پر انشا پردازی تنقید کا مقدر بن گئی ہے۔ دوسرا رجحان تحقیقی اور تنقیدی کام کے سلسلہ میں وہ ہے، جسے من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو۔ یہ الزام آپ چاہیں، تو ان معروضات کے سلسلہ میں مجھ پر بھی لگا سکتے ہیں، لیکن یہ امر واقعہ نہ ہوگا، کیوں کہ مال کے بدلے مال کا لین دین نہ تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پیشہ ہے، اور نہ میرا۔ میں تین دہے کشمیر میں رہا تو پاکستان کے جریدوں، مجلوں اور کتابوں سے محروم رہا۔ اگر کوئی کتاب دیکھی بھی، تو اتفاق سے۔ انہی اتفاقات میں سے نقوش (لاہور) کا نمبر بھی تھا جس میں غالب کی ایک عکسی بیاض چھپی تھی، جسے خود نوشت اور تقویم سے ۱۲۳۱ ہجری کی مکتوبہ بتایا گیا تھا۔ ہندوستان میں بھی یہی "بیاض" فوٹو آفسٹ سے عکسی چھپی تھی۔ دونوں میں فرق تھا۔ ان دونوں بوالعجبیاں نظر آئیں۔ چناں چہ اس پر مضمون لکھنا شروع کیا، جو ہزار صفحے پر جا کر ختم ہوا۔ کانٹ چھانٹ کر بڑے سائز کی ۴۸۸ صفحے کی کتاب ہوئی۔ کتاب چھپی تو اہل علم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، لیکن محققین اور خاص طور سے غالب کے ماہرین کے بہت بند اور محدود سرکٹ نے چپ سادھ لی۔ کچھ جلدیں دوستوں کو پاکستان بھیجی تھیں۔

یہ ۸۷ء کی بات ہے۔ بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ کی ایک جلد میں نے اپنے نوجوان دوست، اور رفیق کار، بشارت احمد کے ہاتھ لطیف الزماں خاں کو بھیجی تھی، جو پشاور کے ایک کالج میں انگریزی ادبیات کے استاد ہیں۔ اُس زمانے میں اپنی اسامی کے ساتھ، دوبارہ کشمیر آئے تین برس ہو چکے تھے۔ (میں ڈائرکٹوریٹ جنرل، آل انڈیا ریڈیو میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر تھا، اور سارے ملک کے اسٹیشنوں کے اردو پروگرام کی نگرانی میری ذمہ داری تھی) بشارت پاکستان سے واپس آئے تو لطیف الزماں خاں کا ایک خط، اور سہ ماہی غالب (کراچی) کا ایک شمارہ لائے (یہ مجلہ ظفر الحسن اور فیض احمد فیض کی ادارت میں نکلتا تھا۔) اس میں بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا دس صفحے کا تبصرہ بھی تھا۔ اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ تبصرہ نگار غالب پر اور بھی جو کچھ اس موضوع سے متعلق لکھا گیا ہے، پوری طرح واقف ہے۔ تبصرے کیا، مقدمے تک کتاب کو ہتھیلی پر اٹھا کر، اور سونگھ کے بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ تبصرے کی ایک تکنیک یہ بھی ہے کہ مقدمے دیباچے پر ایک نظر ڈالی، فلیپ پر چھپی ہوئی آرا دیکھیں، اور تبصرہ لکھ ڈالا۔ اس کتاب میں نہ کوئی دیباچہ ہے اور نہ گرد پوش، اس لیے فلیپ پر بھی کوئی رائے نہیں، تبصرہ پڑھ کر بہت متاثر ہوا، کیوں کہ ڈاکٹر فرمان نے پوری کتاب، آغاز کے الف سے تائے تمت تک پڑھی، اور قابلِ ذکر نکات کا ذکر کیا۔

انھوں نے کتاب کے بارے میں کیا لکھا، اس کے بارے میں، میں کچھ عرض نہیں کروں گا، کیوں کہ یہ بات

میرے مزاج کے خلاف ہے کہ جس پر لکھنا ہو، اس کو سیڑھی بنا کر چڑھا جائے۔ اس فن میں ید طولیٰ رکھنے والوں کی کمی نہیں، لیکن میں اپنا حشر اُن کے ساتھ نہیں چاہتا۔ میں تو اس بات پر بھی شرمندہ ہوں کہ اتنا ذکر میں نے اپنے قلم سے اپنی کتاب کا کیا۔ لیکن مجبوری تھی کہ اسی حوالے سے میں نے فرمان فتح پوری کو پہلی بار جانا۔ یہ دراصل ان کی عظمت کا اعتراف ہے کہ مجھ سے مراسم کیا شناسائی کے بغیر اس کتاب پر انھوں نے رسمی طور سے نہیں لکھا ایک عالم اور ایک محقق کی نظر سے میری حقیر کاوش پر نظر ڈالی۔

ستر کے دہے کے آخر میں دوبارہ دلّی آیا، تو پاکستان کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ میری ایک بری عادت ہے کوئی تحریر سرسری نہیں پڑھتا۔ اخبار بھی نہیں۔ جو کچھ پڑھتا ہوں، مرتب طریقے سے پڑھتا ہوں چنانچہ مختلف جریدوں میں فرمان فتح پوری کے مضامین پڑھے۔ پھر ان کی کتابوں کی طرف رُخ کیا۔ غالب نے ناسخ سے بہت کچھ لیا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے ناسخ کو یک فنا کہا ہے۔ ہمارے یہاں تنقید اور تحقیق میں کچھ یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جو نظر رکھتا ہے، اس کا دائرہ محدود ہے، اور جو نظر نہیں رکھتے ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے اور چھور کی کچھ انھیں بھی اطلاع نہیں۔ چند، جو واقعی نظر رکھتے ہیں اور محدود دائرے میں نہیں گھومتے، ان میں سے فرمان فتح پوری ہیں۔ اردو کی منظوم داستانیں، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو املا اور رسم خط، اردو رباعی، تحقیق و تنقید میر انیس: حیات اور شاعری۔ ان کی کتابیں ہیں۔

اس وقت میں ان کی سوا پانچ سو صفحات کی کتاب "اقبال سب کے لیے" پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اقبالیات اردو میں ایک شعبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود احساس ہوتا ہے کہ ابھی تک اقبال پر وہ کام نہیں ہوا ہے، جو ہونا چاہیے۔ فکرِ اقبال (خلیفہ عبدالحکیم) ذکرِ اقبال (عبدالمجید سالک) روحِ اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اقبال نئی تشکیل (عزیز احمد) حیات اقبال (عنایت اللہ) سیرت اقبال (محمد طاہر فاروقی) زندہ رود (جاوید اقبال) روزگارِ فقیر (دو جلدوں میں، سید وحیدالدین فقیر) کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ بہت سے رسالوں کے اقبال نمبر بھی ہیں۔ شاعر (بمبئی) کے اقبال نمبر میں پروفیسر محمد حسن کا مضمون "اقبال کے تہذیبی رویے" مختصر مگر جامع مضمون ہے۔ جو ان نئی جہات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جن پر کام کیا جانا چاہیے۔ اقبال کے بارے میں ایسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جن میں کوئی بصیرت نہیں۔ ان کی تفصیل فضول ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کتابوں کے ہوتے ہوئے فرمان فتح پوری کو "اقبال سب کے لیے" لکھنے کی ضرورت تھی؟ کتاب پڑھنے سے پہلے یہ سوال ذہن میں تھا۔ کتاب پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوا کہ اس کتاب کی، اور اس کتاب کے لکھے جانے کی ضرورت تھی۔ مشمولات پر نظر ڈالیں تو اس تصنیف کی اہمیت کا اندازہ ہوگا:

۱۔ ماحول، زندگی اور شخصیت: اٹھارویں صدی کے سیاسی حالات کا ایک جائزہ۔ مسلم سائیکی۔ سرسید کی تحریک۔ اس پس منظر میں اقبال کی زندگی، اور ماحول۔ تعلیم سیالکوٹ، لاہور اور یورپ میں۔ اقبال کی شخصیت پر ایک طائرانہ نظر۔

۲۔ تصانیفِ اقبال

۳۔ پیغامِ حیات۔ یا۔ فلسفۂ خودی و بے خودی

۴۔ تصوّرِ تعلیم

۵۔ سیاسی افکار و تحریک پاکستان

۶۔ دنیائے اسلام اور اقبال ـــــ مغرب کے تصورِ قومیت و وطنیت کے خلاف احتجاج
۷۔ اقبال کا فن اور نظریۂ فن
۸۔ اقبال کا تصورِ عقل و عشق
۹۔ اقبال پر مغربی اثرات
۱۰۔ اردو شاعری
۱۱۔ فارسی شاعری
۱۲۔ اقبال اور نئی نسل ـــــ مغرب کی چیرہ دستیاں، مشرق کی بے عملی و بے حسی
۱۳۔ علمی اور ادبی دنیا پر اقبال کے اثرات
۱۴۔ کتابیات

فرمان فتح پوری کراچی میں رہتے ہیں، اور پاکستان میں، نجی گفتگو میں تو لوگ اقبال کے بارے میں آزادی سے بات کرتے ہیں، لیکن تحریر کے وقت ذہن اور قلم پر تحدید ضرور ہوتی ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس فرمان کی کتاب میں ہوتا ہے۔ اقبال کا فن اور نظریۂ فن، اور اقبال کا تصورِ عقل و عشق ایسے ابواب ہیں، جو سدا بہار رہیں گے۔ تیسرے باب میں فلسفۂ خودی و بے خودی قاری کے لیے بہت آسان کر دیا ہے۔ اپنے ان تین ابواب کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت قایم رہے گی۔

کتاب سے پہلے، فرمان نے بہت اچھی بات کہی ہے:

"علامہ اقبال فلسفی بھی ہیں، اور شاعر بھی۔ لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام فلسفی سے بلند تر ہے۔ بلکہ فلسفی کا جو ایک معروف عام مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک بے معنی و ناقابلِ عمل تفکر میں الجھا رہتا ہے، اور جس کی تصویر اکبر الہ آبادی نے اس طور پر کھینچی ہے:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے، اور سرا ملتا نہیں

اس سے اقبال کا کوئی تعلق نہ تھا"

فکر، مرتب فکر، نظامِ فکر کا نام فلسفہ ہے۔ فکر اور نظامِ فکر میں ارتقا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ایک جامد تصور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا اقبال فلسفی تھے؟ وہ جو تحدید کی بات آئی تھی، یہی ہے کہ فرمان شاعر اقبال کو فلسفی اقبال پر ترجیح دینے کی حد سے آگے نہیں جا سکتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنی بات کہہ اٹھے ہیں۔

ص ۷۵ پر فرمان نے بڑے دل نشیں انداز میں اقبال کے اس نظریے کو ذہن نشیں کرایا ہے جو اسرارِ خودی میں خودی کے استحکام اور تخلیقِ مقاصد کے بارے میں بیان کی گئی ہے:

"اسرارِ خودی کی توضیحات کے مطابق، اس جہانِ رنگ و بو کا ظہور، دراصل خودی کی نمود ہے، خودی کی بیداری ہے، تخلیقِ کائنات کا سبب ہے، اور اس کی ذات میں اس طرح کی تخلیقات کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں۔ ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کو کسی نہ کسی اعلا مقصد سے وابستہ رکھا جائے"

ان معروضات کو ص ۲۲۲ کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں جس سے فرمان کے شعورِ فن اور بصیرت کا

اندازہ ہوتا ہے:

"جسے فنی اظہار کہا جاتا ہے، وہ کسی خارجی روپ کا نام نہیں، بلکہ خود فنکار کا اظہار ذات ہے، اور جب تک خود فنکار کی ذات یا داخلیت کسی اعلا نصب العین کے لیے مضطرب و بے چین نہ ہو، وہ خارج میں کوئی تلاطم یا اضطراب پیدا نہیں کر سکتا۔ باطنی شعور کا مؤثر و دلکش فنی اظہار اسی وقت ممکن ہے، جب کہ فنکار اپنے آدرش کے ساتھ جذباتی لگاؤ رکھتا ہو۔ اسی شدید جذباتی لگاؤ کا دوسرا نام خلوص قلب، یا خونِ جگر ہے۔ اس کے بغیر فکر و فن کی ساری بے عمل ہو جاتی ہیں۔"

اور یہ ہے اقبال کا نظریۂ فن:

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

ایم ۔ حبیب خاں

اردو کی منظوم داستانیں

یہ اردو کے مشہور محقق اور تنقید نگار ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تحقیقی مقالہ ہے جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں کتابی صورت میں شایع کیا تھا۔ یہ ۶۹۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ بقول مصنف :

"اس مقالے میں ۱۸۷۰ء/۱۲۸۷ھ تک کی اردو منظوم داستانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے ۔ ان منظوم داستانوں کی نوعیت و اہمیت اور شاعرانہ حسن و اثر کا مفصل ذکر تو آیندہ سطور میں ملے گا ۔ اس جگہ اس قدر کہنا ہے کہ صرف اردو نہیں بلکہ دنیا کی ہر متمدن قوم اور شایستہ زبان میں شروع سے منظوم داستانوں کو قبول عام حاصل رہا ہے اور آج جسے عالمی کلاسیکل ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں زیادہ حصہ منظوم داستانوں ہی کا ہے ۔ یہ منظوم داستانیں صرف یہی نہیں کہ قدیم ترین صنف سخن ہونے کی حیثیت سے تاریخی اہمیت کی حامل ہیں بلکہ ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بھی ان میں عظمت و بزرگی کے آثار ملتے ہیں ۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی تصدیق اس کتاب کے مطالعے سے ہوتی ہے ۔ اردو کی منظوم داستانیں نثری داستانوں سے پہلے لکھی گئیں ۔ اس کی ابتدا پندرھویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوئی اور یہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی تک جاری رہا ۔ "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" ، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دریافت ہے اور جسے ان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کیا اور اس پر تفصیلی مقدمہ لکھا ، اردو کی پہلی منظوم داستان ہے ۔ اسے پندرھویں صدی عیسوی کے درمیان کی تصنیف بتایا جاتا ہے ۔ اس طرح منظوم داستانوں کا یہ سلسلہ فرمان صاحب کے قول کے مطابق ۱۸۷۰ء تک قایم رہا ۔ گویا ساڑھے تین سو برس کے لگ بھگ اس کی عظمت قایم رہی اور ان داستانوں کی فضا رنگا رنگ رہی اس کے مقابلے میں فرمان صاحب کا بیان ہے کہ :

"اس کے برعکس نثری داستانوں کا دور قصہ چہار درویش کے اردو مترجم ۱۷۷۵ء اور فورٹ ولیم کالج کے قیام ۱۸۰۰ء کے درمیانی زمانہ سے شروع ہو کر ۱۸۷۰ء/۱۲۸۷ھ یعنی تہذیب الاخلاق کی تاریخ اجرا پر صرف ۷۰۔۸۰ سال کے عرصے میں ختم ہو جاتا ہے ۔"

فرمان صاحب کا یہ بیان مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ شمالی ہند کی سب سے قدیم داستان قصہ مہر افروز دلبر (عیسوی خاں بہادر) ہے ۔ یہ پروفیسر مسعود حسین خاں کی دریافت ہے اور اسے انھوں نے مرتب کر کے پہلی بار ۱۹۶۶ء میں (فرمان صاحب کی "منظوم داستانیں" کے قبل) حیدرآباد سے شایع کیا ، اس کا دوسرا اڈیشن انجمن ترقی اردو ہند نئی دلی نے ۱۹۸۸ء میں شایع کیا ۔ مرتب نے اس داستان کا زمانۂ تصنیف ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء مقرر کیا ہے ۔ پروفیسر گیان چند بھی مسعود صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں غالباً یہ کتاب فرمان صاحب کی نظر سے نہیں گزری نثری داستانوں کا مشہور دور فورٹ ولیم کالج کے قیام ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس سے الگ ہٹ کر بھی بہت سی داستانیں لکھی گئیں ۔ داستان امیر حمزہ کے آٹھ دفتروں کی ۴۶ جلدیں علیحدہ علیحدہ شایع ہو چکی ہیں ۔ اگر طلسم تاریخ (محمد حسین قمر) کو اسی سلسلے کی کڑی مان لیا جائے تو ۴۷ جلدیں ہو جاتی ہیں ۔ امیر حمزہ کا پانچواں دفتر "طلسم ہوش ربا" ہے اس

کی دس جلدیں ہیں۔ یہ دفتر سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ ۱۸۱۳ء میں نہجور نے "نورتن" لکھی اور باغ و بہار کے جواب میں کافی عرصے کے بعد ۱۸۲۴ء میں رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھی۔ اس کے بعد ہندستان کے مختلف شہروں میں خاص کر کلکتہ، لکھنؤ، رام پور اور دلّی میں داستانیں لکھی گئیں۔ دلّی میں میر باقر علی نے اپنی داستانوں کے ذریعہ اس فن کو آخری شکل دی۔ اس طرح ۱۹۲۹ء تک داستان نویسی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ گویا نثری داستانوں نے دو سو برس تک دلچسپ اور رنگا رنگ بہاریں دکھائیں اور اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا۔ بہر حال اردو کی منظوم داستانوں کو اولیت کا شرف اس لیے حاصل ہے کہ نثر سے پہلے نظم کا وجود ہوا اور بے شمار مثنویاں اور منظوم داستانیں لکھی گئیں۔ فرمان صاحب منظوم داستانوں کی قدامت کے بارے میں باب اول کے شروع میں لکھتے ہیں:

"منظوم داستانوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسانی زندگی اور ان میں اتنی ہی رنگا رنگی و دلکشی ہے جتنی خود انسانی زندگی میں۔ انسانی زندگی کے عمرانی و تہذیبی ارتقا کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو داستان طرازی اور شعر گوئی سے ازلی مناسبت رہی ہے اور اس لیے یہ کہا جائے کہ انسان منظوم داستانوں کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔"

فرمان صاحب کا یہ قول صحیح ہے۔ "اردو کی منظوم داستانیں" سے بہت پہلے "اردو مثنویاں" کے عنوان سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ہماری نظر سے گزر چکی ہے اور اردو تحقیق میں اس کا اہم مقام ہے غالباً یہ کتاب بھی فرمان صاحب کی نظر سے نہیں گزری ورنہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کی منظوم داستانوں پر تفصیلی جائزہ فرمان صاحب ہی کی کتاب میں پیش کیا گیا ہے جس میں داستانوں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں اجاگر کی ہیں۔ ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتیں اسی مقالے کے ذریعہ ہمارے سامنے آئی ہیں۔ سوداؔ کے معاصرین میں میر تقی میرؔ کا اہم مقام ہے۔ میرؔ نے بہت سی مثنویاں لکھیں! شخصی داستانیں بھی نظم کیں۔ ان شخصی داستانوں میں میرؔ کے یہاں شخصی مثنویوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ شخصی مثنویوں میں میرؔ کو ایک معاشقہ زندگی میں پیش آیا۔ ان کے مقابلے میں مومن کئی معشوقوں کو دل دے بیٹھے بقول فرمان صاحب عیش کوشی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میرؔ کے عشق کے بیان میں فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے معاشقے کا آغاز اکبر آباد میں نہیں دلّی میں ہوا ہوگا۔ دلّی میں میرؔ اکبر آباد سے شروع جوانی میں آگئے تھے اور اپنے سوتیلے بھائی سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے یہاں قیام کیا۔ آرزو کی بیٹی سے میرؔ صاحب کو عشق ہو گیا۔ ۱۷۳۹ء کے ہنگامے میں آرزو مع اپنے بچوں کے اکبر آباد چلے گئے۔ میر بھی اکبر آباد چلے گئے۔ فرمان صاحب میرؔ کے معاشقے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر یہ صحیح ہے تو میرؔ کے معاشقے کا آغاز اکبر آباد میں نہیں بلکہ دلّی میں ہوا ہوگا۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۷۳۹ء میں دلّی گئے تھے اور صمصام الدولہ امیر الامرا کے دربار سے ایک روپیہ روز مقرر کیا گیا یہاں اس وقت ان کے ماموں سراج الدین علی خاں بھی موجود تھے۔ اس وقت میر کا سن پندرہ سال کا تھا۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ جوانی پہلے پہل دلّی میں دیوانے پن کا شکار ہو گئی۔ اسی سال ۱۷۳۹ء ہی میں دلّی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ نفسی نفسی کی پکار ہونے لگی اور دلّی خالی ہونے لگی۔"

اس قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ میرؔ اپنی بدحالی کی وجہ سے اپنے وطن اکبر آباد واپس چلے گئے۔ عشق کے جذبے نے انھیں ایسا سرشار کر دیا تھا کہ وہ مجبور تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے بھی اپنے بیوی بچوں کو اکبر آباد بھیج دیا۔ اکبر آباد میں میرؔ کا جب کوئی مددگار نہ رہا تو وہ واپس دلّی چلے گئے اور آرزو کے ہاں قیام کیا۔ آرزو میر کے سوتیلے ماموں تھے۔ فرمان صاحب نے ان کی بیٹی سے میرؔ کے معاشقے کا ذکر کیا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ اکبر آباد سے جب اس

واقعے کی اطلاع حافظ محمد حسین سے آرزو کو ملی تو انھوں نے میر کو گھر سے نکال دیا۔ میر کے اس شعر سے بھی معاشقے کی تصدیق ہوتی ہے ؎

کیا کہوں کیا قدِ بالا ہے   قالب آرزو میں ڈھالا ہے

میر کی تین مثنویوں میں ان کے عشق کی داستان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے مثنوی "جوشِ عشق" کے ابتدائی اشعار کے بارے میں فرمان صاحب نے جو رائے قایم کی ہے وہ درست معلوم ہوتی ہے۔ اس کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

ایک صاحب سے جی لگا میرا   ان کے عشووں نے دل ٹھگا میرا

ابتدا میں تو رہی صحبت   نام سے ان کے تھی مجھے الفت

خوبی ان کی جو سب کہا کرتے   گوش میرے ادھر رہا کرتے

ان اشعار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ میر محبوبہ کے گھر میں رہتے تھے یا گھر میں آنا جانا رہتا تھا یہ بھی ممکن ہے کہ میر کی رہائش محبوبہ کے مکان کے برابر ہو۔ میر نے ذکر میر میں خان آرزو کی بدسلوکی اور اپنی غربت اور خودداری کا ذکر بڑے شد و مد سے کیا ہے۔ فرمان صاحب نے انشا کی محبوبہ کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے اور محبوبہ کی بہادری، جرات اور چھیڑ چھاڑ، کو خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مومن بھی عشق و عاشقی کے چکر سے نہ بچ سکے۔ ویسے مومن خاندانی طبیب تھے۔ اور مذہب کا اثر بچپن سے ان پر غالب تھا۔ مومن نے اپنی محبت کے راز کو کس طرح کھولا وہ سب ان کی مثنویوں سے معلوم ہو جاتا ہے۔ فرمان صاحب نے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے گو مومن حضرت شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید سے گہری ارادت رکھتے تھے۔ مومن نے اپنی پہلی مثنوی "شکایت ستم" میں اپنے عشق کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

فرمان صاحب نے باب ششم میں غیر شخصی مختصر عشقیہ افسانوں کی تفصیلات اور ان پر ناقدانہ محاسبہ کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ شمالی ہند میں منظوم داستانوں کا رواج میر و سودا کے زمانے سے ہوا۔ اور ان ہی کے کلام میں عشقیہ افسانوں کے نمونے ملتے ہیں۔ شیخ چاند، مثنوی نگاری کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چوں کہ سودا نے میر سے قبل شاعری شروع کر دی تھی یہاں تک کہ جب اس کی شاعری کی دھوم تھی اور عام شہرت تھی اس وقت، میر نے ابتدا کی تھی"[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ سودا نے مثنوی کے میدان میں پہل کی اور سب سے پہلی مثنوی "قصہ درعشق پسر شیشہ گر بہ زرگر پسر" لکھی لیکن فنی اعتبار سے میر کا مرتبہ سودا سے بلند ہے۔ میر کی مثنویوں میں جو تڑپ اور سوز و گداز ہے وہ سودا کے یہاں مفقود ہے۔ میر و سودا کے ہم عصروں میں مرزا جان بیگ ساقی مشہور شاعر تھے انھوں نے بھی ایک عشقیہ قصہ لکھا تھا۔ فرمان صاحب نے لچھمی نرائن شفیق کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے مگر اس قصے کا سراغ ان کو بھی نہیں مل سکا۔ مصحفی نے بھی ساقی کے قصے کا ذکر کیا ہے مگر اس نسخے کے سراغ میں وہ بھی ناکام رہے۔ آخر میں نویں باب میں فرمان صاحب نے منظوم داستانوں کے عروج و زوال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مطالعہ عمیق اور نظر گہری ہے۔ نیاز فتح پوری سے وطنی رشتہ بھی ہے اور اس رشتے کو نیاز کے رسالے "نگار" کو ان کی مقدس امانت سمجھ کر نیاز مرحوم کی یاد قایم کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح فرمان صاحب کا اٹوٹ رشتہ اردو صحافت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اور انھوں نے نگار کے کئی خاص نمبر مرتب کیے ہیں اور جن کی افادیت سے انکار نہیں

---

[1] فرمان فتحپوری۔ اردو کی منظوم داستانیں ص ۲۷۹ مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۱ء

کیا جا سکتا۔ فرمان صاحب نے ۲۵، ۳۰ کے قریب کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن مجھے ان کی تین کتابوں نے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ ان میں ایک اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ہے یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے دوسری اردو کی منظوم داستانیں، جن کا تجزیہ پیش کر چکا ہوں اور تیسری "اقبال سب کے لیے" ہے۔ یہ کتاب اقبال شناسی میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اس میں فکر اقبال کے بارے میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں اجاگر ہوئی ہیں جو ان کی تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ فرمان صاحب نے قدیم ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کا ثبوت ان کی کتابوں اور تحریروں سے ملتا ہے پاکستانیوں کے لیے خاص کر بڑے فخر کی بات ہے کہ ان کے یہاں ایک ایسی شخصیت موجود ہے جس نے تحقیق و تنقید کی اعلا قدریں متعین کی ہیں۔

ابوالفیض سحر

ڈاکٹر فرمان فتحپوری — ایک تاثر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو دنیا کا ایک معروف و مشہور نام، ایک محترم اور معتبر شخصیت، بلکہ سچ پوچھیے تو اردو تہذیب کا ایک مہذب عنوان ہے۔ یوں تو میں ان سے بہت پہلے سے مگر دُور دُور سے واقف تھا۔ پہلی ملاقات کئی برس پہلے غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ہوئی تھی۔ دیر تک اردو ادب، بالخصوص پاکستانی ادب کے مختلف پہلوؤں پر مابعد تقسیم کے تہذیبی و ثقافتی اثرات پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بیچ بیچ میں کچھ وضاحت طلبیوں اور کچھ اہم استفسارات کے ساتھ ساتھ تمام بات چیت کے دوران سادگی سے مگر پوری شگفتگی اور شادابی سے گفتگو کو معلومات افزا اور دل پذیر بھی بناتے رہے۔ خندہ پیشانی، فراخ دلی، کھلا ذہن، وسیع تجربہ اور مشاہدہ، نکتہ رس نظر، خیالات کی جامعیت کے ساتھ ترسیل، پھر اپنا پن، شفقت، محبت، الخلوص، دوستانہ ماحول، خیالات اور تاثرات کا رنگا رنگ منظر نامہ۔ کون کافر ہے جو ایسی ملاقاتوں اور صحبتوں کے حظ اور لطف سے انکار کرے۔ بہر حال، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ شخصیت کا یہ کھرا پن، مزاج کی دل نوازی، مرنجان مرنج طبیعت، یہ اور اس طرح کی گفتار اور کردار کی دولتیں، ان دنوں ادبی دنیا میں کہاں میسر آتی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان اپنے اخلاص اور بے ریا سادگی سے دوسروں کو جیت لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مزاج میں صداقت پسندی اور محبت و ریاضت کی آسودگی کے خاص جوہر بھی پائے جاتے ہیں ورنہ ؎

ذرا سی بات پہ کرتے ہیں فخر خصیص
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں فیروز سنز کے اردو انسائیکلو پیڈیا کے تیسرے ایڈیشن (۱۹۸۴ء) میں جو لکھا ہے نقل کرتا چلوں۔

"فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (۱۹۲۶ء) ادیب، محقق، نقاد سید دلدار علی نام قصبہ فتح پور ہسوہ (یوپی، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایل ایل بی اور بی ایڈ کیا کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ بعد ازاں اسی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں زبان اور رسم الخط کے عنوان سے نگار (لکھنؤ) میں مقالات لکھ کر علمی و ادبی دنیا سے متعارف ہوئے۔ ڈیڑھ سو سے زاید تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تقریباً بیس بائیس کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔" لیکن اس بیچ، ان کی خدمات کے سلسلۂ چراغاں میں کئی نئے چراغ بھی روشن ہوئے ہیں۔ ان کی روشنی کو محسوس نہ کرنا بے بصارتی کی دلیل ہوگی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، بنیادی طور پر، اردو زبان و ادب کے بلند مرتبہ استاد ہیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے وہ مزاج داں ہی نہیں، رمز آشنا بھی ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بہت گہری ہے۔ اگرچہ، کلاسیکی ادب سے انھیں شروع سے خصوصی دلچسپی رہی ہے لیکن نئے فنی مسائل و مباحث سے بھی وہ خوب

بہرہ ور ہیں۔ نیاز فتح پوری سے نیاز اور نگار سے مثالی وابستگی نے ان کے ادبی قدر و قامت میں آبرومندانہ اضافہ کیا۔ اب بھی وہ نگار کو نیاز کی ایک مقدس امانت کے طور پر جی جان سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ وفاداری بہ شرط استواری اصل ایمان ہے' کے مصداق ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نیاز سے، نگار سے اور ان دونوں کے حوالوں سے اردو زبان و ادب اور اردو کی ادبی صحافت سے اٹوٹ اور بے لوث رشتہ جوڑا ہے اور اپنے قلم کی زبان حق گو و حق پسند کی وساطت سے، خون دل اور خون جگر سے جو آیات فکر و فن رقم کی ہیں اسے اردو ادب کی نئی تاریخ میں، جسے کہیں رنگوں کہیں روشنیوں سے اور کہیں خون آشامانیوں کی روداد ول سے ترتیب دیا جائے گا، آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو زبان و ادب کے بلند مرتبہ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق بھی ہیں تحقیق، شب و روز کی ریاضت راہبانہ اور محنت شاقہ کے دوش بدوش' استقلال اور انہماک کی مقدس دیوانگی بھی چاہتی ہے۔ جب اس زاویہ سے بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی علمی و ادبی تحقیقی خدمات پر نظر ڈالی جائے تو اردو دنیا کو مایوسی نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک اعتبار ملتا ہے اور اعتبار کا معیار ملتا ہے کہ تحقیق کے سر سے پاکستان میں بھی آبرو کی چادر ابھی ڈھلکی نہیں ہے۔ حوالوں اور مقالوں کی حاجت نہیں خود ان کے پر وقار تحقیقی کارنامے اور ان کی مستند تصانیف، جامع مقالے اور وقیع عبارتیں' اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اردو کی منظوم داستانیں لسانیاتی مطالعے اور تذکرہ نگاری ان کی دل چسپی کے خصوصی میدان رہے ہیں۔ فی الوقت میں یہاں اسی سلسلے کی ایک خاص بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں گا، جو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نگار" کے فروری ۱۹۹۱ء کے ولی نمبر میں' جناب نور نیس احمد ادیب کی اہم تصنیف" اردو کا پہلا شاعر، پہلا مدون" کو دوبارہ شایع کرتے ہوئے کہی ہے۔ ہم خیال ہونے کے ناطے، نظریاتی اور تجزیاتی، دونوں سطحوں پر بھی میں اسے خصوصی اہمیت دیتا ہوں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بہ حیثیت ایڈیٹر، ادارتی نوٹ لکھتے ہوئے لکھا ہے۔

> "افسوس کہ ۱۹۴۰ء کے بعد، اردو میں ان پر (ولی پر)، جو تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے اس میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ کتاب ناقدین و محققین کی نظر سے نہ گزری ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے اس سے فیض اٹھانے کے باوصف حوالہ دینا ضروری نہ جانا ہو، اس لیے کہ ہمارے ہاں عام طور پر بڑے اور بہت ممتاز و مشہور اہل قلم کے کمزور سے کمزور حوالوں کو تو تحریر کی زینت بنا لیا جاتا ہے لیکن کم مشہور لکھنے والوں کی قیمتی سے قیمتی اور اہم سے اہم تحریر کو بھی استفادہ کرنے کے باوجود نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔"

میرے خیال میں، اس غیر مہذب طرز عمل کی محض ایک افسوس ناک رویہ کے طور پر مذمت سے ہی حق ادا نہیں ہوتا بلکہ اس ادبی بد دیانتی کے ناپسندیدہ سائے سے بھی ادبی ارتقا کے تذکروں اور فکری و فنی تلاش و جستجو کو بچائے رکھنے کی روایت کو فروغ دینا چاہیے۔

اس طرح، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو زبان و ادب کے بلند مرتبہ استاد اور ایک محقق معتبر ہونے کے ساتھ ایک زاہد شب زندہ دار کی حیثیت کے ادبی صحافی بھی ہیں اور ایک ممتاز نقاد بھی۔ تنقید کے باب میں کئی اہم مقالات کے علاوہ وہ کئی اہم مستقل تصانیف بھی آپ کی ریاضت لوح و قلم کی یادگار ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ان کی ایک اہم اور مشہور کتاب" اقبال سب کے لیے" رکھی ہوئی ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرت

کو واضح کرنے کے لیے اس کتاب سے صرف ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو اقبال شناسی کی بھرپور جھلک پیش کرتا ہے ساتھ ہی تنقید، تنقیدی زبان اور تنقیدی رویہ کی بھی ایک اچھی مثال ہے ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ آذری ہو یا براہیمی جادۂ تسلیم پر ثابت قدم رہنا اور جنونِ عاشقی میں خود کو کامل ثابت کرنا، اقبال کے فلسفۂ حیات کی اہم کڑی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز سے بالاتر رہ کر جن کے خیالات و افکار کو اپنے مسلک سے قریب تر پایا ہے اسے اپنایا ہے، دل کھول کر داد دی ہے اور فیض رسانی کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں اقبال کے یہاں ملتی ہیں اور بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک ہر دور کی شاعری میں یکساں دخیل نظر آتی ہے بانگ درا میں آفتاب کے عنوان سے جو نظم ہے وہ گایتری میں رگ وید کی ایک قدیم دعا کا ترجمہ ہے اسی طرح نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا گیت، سوامی رام تیرتھ اور ہمالہ، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اس بات کی نفی کرتی ہیں کہ اقبال فرقہ پرست تھا یا اس کے پیغام کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔ زندگی اور فکر و فن کا یہ آفاقی زاویہ نظر آخر تک اس کے یہاں کار فرما رہا ہے۔ ثبوت میں جاوید نامہ سے اقبال کی سیر افلاک کا وہ منظر پیش کیا جا سکتا ہے جس میں مولانا روم، اقبال کی ملاقات، عارف ہندی، جہاں دوست یعنی وشوامتر سے کراتے ہیں وشوامتر کا اقبال کے نظر میں کیا مقام ہے اس کا مفصل بیان مطالعے کے لائق ہے؛

فکر اقبال کے بارے میں ایک پاکستانی دانشور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ بیان ان کی تنقیدی بصیرت کے علاوہ ان کے صاف ذہن ان کی کشادہ قلبی اور اعلا ظرفی کی خوشبو کا بھی پتا دیتا ہے۔

جیسا کہ اردو دنیا واقف ہے، تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک خصوصی میدان رہا ہے۔ تفصیلی بحث کرنے کا وقت نہیں ہے، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تنقید تو کسی خاص اسکول کی چھاپ نہیں ہے اور یہ کسی خاص ازم یا کسی خاص گروہی وفاداری کے علمبردار نہیں رہے۔ ان کا مسلک ادب اور ارتقا ادب کی معیار بندی اور فن اور فن کی تحقیق کی قدر شناسی سے متصف رہا ہے اور یہ واقعی ایک بڑی بات ہے جب کہ علمی دنیا اور ادبی ماحول بھی طرح طرح کی آلودگیوں کی وجہ سے کبھی پوری طرح، غبار آلودہ نظر آتا ہے تو کبھی کچھ حد تک گھناونا بھی ہو جاتا ہے عدم توازن، جانب داریت یا مصلحت کوشی و مصلحت پسندی ذاتی اور جماعتی شیوہ و شعار کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

بات ادھوری رہ جائے گی اگر میں تنقید میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی زبان اور ان کے اسلوب کے بارے میں بھی کچھ عرض نہ کروں۔ میرا خیال ہے کہ باوجود اس حقیقت کے کہ فرمان فتح پوری نیاز کے بہت قریب رہے ان کے زیر اثر بھی رہے مگر اپنے ادبی مسلک میں بڑی حد تک بے نیاز ہی رہے۔ یہ نظر غائر ان کی انتقادی کاوشوں کا مطالعہ کیا جائے اور تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر عبدالحق کے مکتبِ فکر کے پاس دار رہے ہیں انھوں نے ہمیشہ معروضی انداز کو اپنایا ہے زبان سادہ، سلیس اور دو ٹوک، صاف اور شفاف گہرائی اور گیرائی، تہہ داریت اور معنی آفرینی، چونکا دینے والی فقرے بازی یا عبارت آرائی کے قصد سے پاک اور مبرا۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

> " ایسی صورت میں اگر حکمائے جمالیات یعنی حسن کی ماہیت پر مجرد بحث کرنے والوں میں اختلاف رائے نظر آئے یا ان کے نظریات ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیں تو ہمیں چنداں تعجب نہ کرنا چاہیے یہ اختلاف و تصادم یوں ناگزیر ہے کہ حسن کی وسعت لامحدود

اور اس کی رنگارنگی بے پایاں اور اس کا عمق اتھاہ ہے اور کسی ایک فرد کے بس کی یہ بات نہیں کہ وہ اس کے جمال و جلال کے سارے پہلوؤں کو مکمل احساس اور بھرپور اظہار کے ساتھ اپنی گرفت میں لے سکے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حسن کی سحر کاریاں و کرشمہ سازیاں ہر لحظ اور ہر آن بدلتی رہتی ہیں اور اس کی رعنائیوں اور دلداریوں کے بے شمار ایسے نکتے اور پہلو ہیں جو بے رنگ، بے صوت اور بے نام ہیں۔"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی علمی و ادبی خدمات کا ان کا اپنا مقام و معیار ہے اور یقین ہے کہ اردو دنیا میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن پاکستان میں اردو لغت کے عظیم منصوبے سے ان کی وابستگی نے انھیں ایک ایسے مدار پر پہنچا دیا ہے جہاں سے ان کا علمی سفر انھیں اردو زبان و ادب کی دائمی شہرت و عظمت کی منزلوں سے ہم کنار کرا سکتا ہے۔ یہ اردو لغت، ترقی اردو بورڈ کراچی کے زیر اہتمام تاریخی اصولوں پر مدون ہو رہی ہے۔ بورڈ کے پہلے صدر محمد ہادی حسین تھے اور لغت کے پہلے مدیر اعلا بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۱ء) ان کے بعد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۷ء) کے مدیر اعلا رہے۔ مدیران اول کی حیثیت سے ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۳ء اور مولانا نسیم امروہوی ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۹ء تک مدیر اول کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس اہم علمی کام سے جوش ملیح آبادی بھی وابستہ رہے ڈاکٹر شان الحق حقی نے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں اور کئی اہل قلم اس عظیم الشان منصوبے سے مختلف حیثیتوں میں متعلق رہے۔ ان دنوں ڈاکٹر فرمان فتحپوری بھی اس سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں یہ شرف اور یہ موقع کم ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ ۱۹۸۶ میں جب میں ہندوستانی ادیبوں اور دانشوروں کے وفد کے رکن کی حیثیت سے پاکستان کے سرکاری دورے پر کراچی گیا تھا تو موصوف نے بڑے پر خلوص انداز میں اور خاصے اہتمام کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا تھا اور سارے کام کی تفصیلات سے واقف کروایا تھا اور لغت کی چھ جلدیں بطور تحفہ عنایت فرمائی تھیں۔ بہر حال ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اس اساسی اور آفاقی ادبیت کے عظیم الشان منصوبے، وابستگی یقیناً اس بات کی ضامن ہے کہ اردو خدمات کی اس یورسٹ پر کامیابی و کامرانی کا پرچم جب بھی لہرائے گا اور جب تک لہرائے گا اس وقت تک اس پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا نام بھی اردو کے مایہ ناز خدمت گزاروں علم و ادب کے ساتھ پر وقار انداز میں لہراتا رہے گا۔

پروفیسر وقار عظیم

غالب، شاعر امروز و فردا" میری نظر میں[1]

غالب کی سو برس سے زیادہ مدتیں گزریں کہ ہو چکی لیکن اس کی آمد آمد کے ساتھ علم و ادب کی دنیا میں جو ہلچل پیدا ہوئی تھی اُس کا زور اب تک نہیں تھما۔ تحقیق اور تنقید نے اس عظیم انسان اور عظیم شاعر کی عظمت کے اعتراف کے جو منصوبے بنائے تھے ان کی تکمیل کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد غالب پر کوئی نہ کوئی تحقیقی، تنقیدی یا ملی جلی تحقیقی و تنقیدی کتاب شایع ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ تحقیق اور تنقید کا یہ صدقۂ جاریہ یوں ہی جاری رہے گا اور خدا کرے کہ جاری رہے کہ غالب کے فکر و فن کی تازگی اور ہمیشگی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

اس صدقۂ جاریہ کی تازہ ترین صورت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین کا مجموعہ "غالب شاعر امروز و فردا" ہے اس مجموعے میں ۱۵ تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں غالب کی شخصیت اور شاعری کو مختلف زاویوں سے دیکھا جانچا اور پرکھا گیا ہے اور فن اور فن کار دونوں کی ایسی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے خد و خال موزوں اور متناسب بھی ہوں اور رنگ و آہنگ دل آویز اور جاذب نظر۔ یہ منصب جس سلیقے اور انداز سے ادا کیا گیا ہے اس میں ہر جگہ تازگی و شگفتگی ہے اور پڑھنے والا ہر مضمون پڑھ کر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ غالب کے کلام کا مرتبہ و مقام یہ ہے کہ اس میں اب بھی تاویل و توجیہہ کے نئے نئے رُخ نکل سکتے ہیں بشرطیکہ غالب کے ساتھ محقق، مبصر اور نقاد کا ذہنی اور جذباتی تعلق، زندگی بھر کی رفاقت، دمسازی، خلوص اور یگانگت کا نتیجہ ہو۔ یہ سب مضامین بقول مصنف 'غالب کی ہشت پہلو، ذات، جامع الصفات شخصیت، صد رنگ فن اور ہزار شیوہ ادبیت کی وکالت اور وضاحت کی غرض سے لکھے گئے ہیں اور تحقیق نے منطق کی خوش استدلالی اور تنقید نے فلسفے کی خوش فکری کی مدد سے محقق اور نقاد کی راہ کو آسان بنایا ہے۔

غالب کے اولین تعارف نگار، غالب اور غالب تخلص کے اردو شعرا، غالب کے حالات میں پہلا مضمون، غالب کی یادگار قایم کرنے کی اولیں تجویز اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی اور غالب اور اقبال، غالب نسخہ حمیدیہ کی روشنی میں اور غالب، شاعر امروز و فردا نیم تحقیقی، نیم تنقیدی یا ملے جلے تحقیقی و تنقیدی مضمون ہیں۔ ان مضامین کی بنیادی خصوصیت ہیں نے منطقی خوش استدلالی کو بتایا ہے اور منطق میں خوش استدلالی کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ آپ کی طرح میں بھی سیاست دانوں، وکیلوں، واعظوں اور مناظروں کے ہاتھوں منطق کی روایتی زبوں حالی کے افسانے سن چکا ہوں سوءِ استدلال نے زندگی کے ہر دور میں منطق کو الجھاوے ڈالنے اور مغالطے پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ منطقی مغالطوں کی جامہ دری سے محققوں کے دامن بھی محفوظ نہیں۔ اس لیے کہ تنگ نظری اور سبک سری کو نیند ہی ان مغالطوں کی چھاؤں میں آتی ہے۔ لہٰذا منطق، خوش استدلالی نہیں تو اس کا عدم وجود برابر ہے۔ سچی صحیح اور دیانت دارانہ تحقیق کا راستہ ہی خوش استدلالی کا راستہ ہے اور یہ بات ان سب مضمونوں میں بدرجہ

---

[1] یہ مضمون پروفیسر وقار عظیم صاحب نے لاہور میں غالب شاعر امروز و فردا" کی تقریب تعارف میں پڑھا تھا آج سے کوئی بیس سال پہلے

اتم موجود ہے جن کے نام میں نے ابھی لیے۔

فرمان صاحب، بات ایک چھوٹے سے دعوے سے شروع کرتے ہیں، اس دعوے کی صداقت کے اثبات میں صاف، سیدھے اور واضح صغریٰ اور کبریٰ قایم کرتے ہیں اور ان سے ایک صریحی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ فوراً ہی ایک نئے منطقی قیاس کا مقدمہ بنتا ہے اور صغریٰ و کبریٰ کی ایک نئی ترتیب کسی اور نتیجے کے استنباط کا ذریعہ بنتی ہے۔ مقدمات، مفرد، ملتف اور مرکب قضیات کی ترتیب، قیاس، استخراج، استقرار، استنباط اور استنتاج کے کئی مرحلوں سے گزرتی ہوئی یہ منطق بالآخر کسی ایسی دریافت کا سبب بنتی ہے جسے ادب کے مسلمات میں جگہ ملتی ہے۔ فرمان صاحب کی تحقیقی مضامین نے منطق کے اسی انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی ہیں جنھیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔ منطق کے جن مرحلوں کا ذکر میں نے ابھی ان تحقیقی مضامین کے سلسلے میں کیا ہے ان میں بڑی سبک رفتاری سے ابھرنے اور آگے بڑھنے والی تمثیل کی کیفیت ہے، جو شوق اور تجسس کو ابھارتی، ذہن کو شک و یقین کے زیر و بم سے گزرتی ایک ایسے انجام تک پہنچتی ہے جو ہر پڑھنے والے کے لیے قابل قبول ہو۔ منطقی استدلال کا ایک اور وصف جو اِن سارے مضامین میں جاری و ساری ہے اس کے لہجے کی ایسی متانت اور بردباری ہے جس نے شگفتہ روئی اور دل داری کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دمساز بنایا ہے۔ اس تحقیق نے دیانت دارانہ اور محبت آمیز وکالت کو اپنا وظیفہ بنایا اور ہمیشہ خوش بیانی سے اسے پورا کیا ہے۔

مجموعے کی تنقیدی مضامین میں بدیہی طور پر تازگی، شگفتگی اور خوش بیانی کا وصف اس سے بھی زیادہ ہے جتنا کچھ تحقیقی مضامین میں اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ تحقیقی مضامین جس طرز استدلال کا مطالبہ کرتے ہیں اس میں ذہنی عمل کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے ہوئے تنقیدی مضامین میں تبصرے اور تحسین کے مرحلے دل کی راہ سے طے ہوتے ہیں اور یہی فرق تازگی، شگفتگی اور خوش بیانی کے مدارج میں فرق پیدا کرتا ہے۔

غالب کے کلام سے اپنے ذاتی اور شخصی رشتے کا ذکر کرتے ہوئے فرمان صاحب نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا ہے کہ وہ غالب کی نبوت شعری پر ایمان رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر مرحلے پر اسے اپنا رہنما اور مشکل کشا سمجھتے رہے ہیں۔ شاعر اور اُس کے قاری کے باہمی تعلق کی رشتے کی نوعیت اس حد تک جذباتی ہو کہ وہ اس کا پرستار بن جائے تو تعریف و توصیف میں اسے غلو اور اغراق کی حدوں سے گزر جانے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ کسی کو اس سے اس کا یہ حق چھیننے کا اختیار نہیں۔ یہ اس کے دل کا معاملہ ہے اور دل کی شریعت اس خاص معاملے میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ چوں و چرا کے عالمگیر ضابطے یہاں استعمال نہیں کیے جاتے۔ یہ سب کچھ درست، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل کے معاملے والی بات ہوتی بڑی ظالم ہے۔ اسے چھپا رکھیے تو دل ناسور بن جاتا ہے اور اس لیے آدمی پر قانون قدرت کا جبر ہے کہ وہ دل کی بات کو دل کے باہر نکالے اور ساری دنیا کو اپنے درد کا ساتھی بنائے، یوں کہ دنیا اس کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگے اور احساس میں من و تو کا فرق اور امتیاز باقی نہ رہے۔ جھگڑا یہیں سے شروع ہوتا ہے اور کیوں اور کیسے کے تیروں کی بوچھار سے کلیجہ چھلنی ہونے لگتا ہے۔ دل کے باہر کی دنیا تعریف و توصیف کے اسباب جاننا چاہتی ہے اور اپنے درد کو دنیا کا درد بنانے کی آرزو رکھنے والا انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر اپنی وکالت شروع کرتا ہے۔ اس وکالت کا پہلا مرحلہ محاسبۂ نفس ہے، یعنی اس بات کی جانچ، پرکھ اور تلاش کہ میں کسی کے حُسن کا فریفتہ اور پرستار کیوں بن گیا؟ جس دل والے کو اس بات کا صحیح جواب مل جائے وہ نقاد ہے اور جو نقاد اس صحیح بات کو لفظوں کی مدد سے دوسروں کے دل میں اتار سکے وہ اچھا نقاد۔ فرمان فتح پوری نے غالب کی محبت، شیفتگی اور پرستاری کا داخلی سفر انھیں مرحلوں میں سے گزر کر طے کیا ہے اور ان کی سلامتی طبع نے حُسن بیان کو اپنا رفیق بنا کر اپنے محسوسات کی پوری دنیا کو دوسروں کے محسوسات کی دنیا تک پہنچا دینے کا کھرا

سر کیا ہے۔ غالبؔ کے کلام کے مطالعے سے قاری جن جن نازک تجربات ہیں سے گزرتا ہے انھیں ادراک سے اظہار میں منتقل کرنے کی سعادت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ بلاشبہ فرمانؔ فتح پوری کی تنقید اس قابل رشک سعادت کی حصہ دار ہے۔

فرمان صاحب نے غالب کو "شاعر امروز و فردا" کہہ کر محض تحسین و توصیف کا رسمی فریضہ ادا نہیں کیا۔ ان کی تحقیق اور تنقید روایتی آداب و رسوم کو محترم سمجھنے اور ان کی پیروی اور پابندی کرنے کے معاملے میں بڑی قدامت پسند ہے، لیکن قدامت پسندی کے اس میلان کو انھوں نے سوچ سمجھ کر اور اس سے جذباتی طور پر ہم آہنگ ہو کر اختیار کیا ہے۔ کسی شاعر کو بہ یک وقت شاعر امروز و شاعر فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیانی فصل و بُعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانون فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔ یہ نظر جتنی تیز، جتنی دور بیں اور جتنی دور رس ہو گی اسی حد تک شاعر کے فکر، تخیل اور جذبے میں رسائی کی وہ کیفیت پیدا ہو گی جس کی بدولت وقت کی طنابیں کھینچ کر ماضی، حال اور مستقبل کو ایک نقطے پر لے آتی ہیں۔ آج کا شاعر ہر دور کے انسان کے جذبے کا ترجمان بن جاتا ہے اور اس کی شاعری میں ہر دور کے احساس تعبیر کا وصف پیدا ہو جاتا ہے۔ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے معانی کی تہیں یوں کھلتی ہیں کہ ہر انسان انفرادی طور پر اور ہر عہد بہ حیثیت مجموعی ان میں اپنی محرومی، اپنے غم، اپنی آرزو اور اپنے عزم کی تصویریں دیکھتا ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعر امروز و فردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کے احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

بالکل شخصی سطح پر فرمانؔ صاحب نے غالب کو ایک بطلِ عظیم کے پیکر میں بھی دیکھا ہے اور اس کی ذات میں انھیں محبوبی کے جلوے بھی نظر آئے ہیں اور ان دونوں حیثیتوں کی انھوں نے پوری فراخ دلی سے داد دی ہے، اس کے باوجود ان کی تحقیق اور تنقید دونوں کا دامن افراط و تفریط کی دست برد سے محفوظ رہا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تنقید

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو بالعموم دبستان نگار و نیاز کا نمایندہ نقاد شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن غور کیجیے تو مولانا نیاز فتح پوری سے ان کی نیاز مندی اور رسالہ نگار سے ان کی دیرینہ وابستگی ان کی سماجی زندگی کے زاویے ہیں۔ بلاشبہ ان دونوں کے اثرات ان کے ادب پر بھی پڑے ہیں لیکن ان کے مجموعی کام کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرمان فتح پوری نے تنقید میں اپنی راہ الگ تراشی ہے اور اس عمل میں انھوں نے اپنی ذاتی مطالعے کو اساسی حیثیت دی ہے۔ چناں چہ انھیں نیاز و نگار کا مقلد شمار کرنا مناسب نہیں۔

رسالہ نگار نے خرد افروزی کی تحریک کو پروان چڑھانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ تاہم نیاز فتح پوری کا ادبی رویہ اور مزاج رومانی تھا۔ نیاز فتح پوری تخلیق کے بطون سے معنی کی فنی پرتیں دریافت کرنے اور سابقہ آرا کی مقبولیت سے متاثر ہونے کے بجائے نیا تنقیدی فیصلہ دینے اور اپنے رومانی رویّے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ فرمان فتح پوری کی تنقید کا رویہ کلاسیکی ہے۔ وہ ادب پارے کی ساخت کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور اس کی ادبی جمالیات کو دریافت کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ کسی شاعر یا ادیب کا مطالعہ کرتے وقت جزو کو اہمیت دینے کے بجائے شاعر کے پورے ادبی اثاثے کو پیش نظر رکھ کر ان کی انفرادیت دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس عمل میں وہ نہ صرف جمالیاتِ ادب کو ہی پیشِ نظر رکھتے ہیں بلکہ تاریخی اور سماجی عوامل، ادیب کے رجحانات داخلی نفسیات، اور نظریات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ چناں چہ ایک ایسے دور میں جب نقاد اور ادیب مختلف گروہوں اور خانوں میں بٹے ہوتے ہیں اور اپنی ذات کو نظریات کی اسیری سے نجات دلانے کی کوشش تک نہیں کرتے۔ فرمان صاحب نے کشادہ نظری اور وسیع النیالی کا مشرب اپنایا، اور تخلیق کو کسی خاص نظریے کی عینک سے منعکس کرنے کی بجائے اس رنگ کو تلاش کرنے کی کاوش کی جو تخلیق کے بطون سے ابھرتا اور قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمان صاحب نے جو ادبی فیصلے دیئے ہیں۔ ان سے تعصب کی بو نہیں آتی اور ان کے معاصرین ان فیصلوں کو قبول کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری چوں کہ محققِ ادب بھی ہیں۔ اس لیے وہ تنقید میں بھی دریافتِ صداقت پر ہی زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے افسانہ، شاعری، تذکرہ نگاری اور داستان کی اصناف پر قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے اور ان کی بعض کتب مثلاً "اردو کی منظوم داستانیں" اور "اردو میں تذکرہ نگاری" کو تا حال حرفِ آخر کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ انھوں نے اپنی گراں قدر تالیف "اردو ہندی تنازعہ" میں جس منصف مزاجی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال ان کے معاصر ناقدین کے ہاں دستیاب نہیں۔ بے شک یہ کتاب ایک پاکستانی کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس سے ان کی اردو دوستی کے پختہ نقوش بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اساسی مواد کی فراہمی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور وہ ایسے نتائج تک پہنچے ہیں جن کا ثبوت ان کے فراہم کردہ اقتباسات اور حوالہ جاتی کتب میں موجود ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہے کہ فرمان صاحب مواد کو اپنے تنقیدی فیصلے کے تابع

کرنے کی سعی نہیں کرتے بلکہ خود مواد ان کی راہنمائی جس فیصلے یا جس نتیجے کی طرف کرتا ہے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور پھر اسی کی اساس پر بحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔ "اردو ہندی تنازعہ" ایک بے حد نازک موضوع پر لکھی گئی کتاب ہے۔ لیکن اس کتاب کے بطون سے فرمان صاحب ایک ایسے نقاد کی صورت میں سامنے آتے ہیں جن کی دیانت پر کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔ چناں چہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کتاب نے بہت سے متعصبانہ لسانی فیصلوں کی کایا پلٹ دی ہے اور ہمیں اردو کی حقیقی فضیلت اور قوت سے روشناس کرایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالبؔ، اقبالؔ اور میر انیسؔ کی شناسائی کو فروغِ عام دینے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان شعراء سے پہلے اپنا جذباتی تعلق پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کی تفہیم میں ہمدردانہ رویے کو برقرار رکھتے ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اخلاقی نقاط سے صرف نظر کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اختلاف کو ادب کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں لیکن ان کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اختلاف کی نوعیت ادبی ہونی چاہیئے ذاتی نہیں۔ اس کے اظہار میں شائستگی کو ہمیشہ فوقیت ملنی چاہیئے اور کردار شکنی کے رویے سے نقاد کو گریز کرنا چاہیئے۔ یہ دستور العمل ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ادبی منشور ہے جو اگرچہ نہیں لکھا ہے لیکن اس پر انھوں نے ہمیشہ عمل کیا ہے۔ اس کے بہت سے نقوش ان کے تنقیدی مضامین میں بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ اور نگار کے اداریوں سے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ میں انھیں اردو ادب کا ایک ایسا نقاد تصور کرتا ہوں جو ماضی اور حال کے ادیبوں کے درمیان رابطہ پل کا کام دیتا ہے اور نئے اور پرانے ادیبوں کے ساتھ نسبت قائم رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

آپ کے فرمان فتحپوری میرے دلدار بھائی

"یہ مضمون ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تازہ کتاب "غالب شاعر امروز و فردا" کی افتتاحی تقریب میں پڑھا
یہ تقریب "بزمِ کتاب" کے زیرِ اہتمام ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی شام کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ جلسے کی
صدارت مولانا حامد علی خاں صاحب نے کی۔ مولانا غلام رسول مہرؔ، پروفیسر وقار عظیم، میرزا
ادیب اور پروفیسر سجاد باقر رضوی نے مضامین پڑھے"

یہ حضرات جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں نام کے دلدار اور تخلص کے فرمان ہیں۔ فرمان سے فرماں برداری ذہن میں آتی ہے یا فرمان روائی تو صاحب اردو غزل شاہد ہے کہ دلدار کبھی فرمان بردار نہیں ہوتا۔ فرمان روا البتہ ہوتا ہے اور فرمان صاحب تو فتح پور کبھی ہیں کہ فتح آدھی نہیں، پوری چاہتے ہیں الفاظ اور تلازمات سے میں فقرے بازی نہیں کر رہا ہوں۔ میری امکان بھر کوشش فقرے سازی کی ہے کہ انھیں فقروں میں میں سید دلدار علی یا فرمان فتح پوری کو سمجھ سکا ہوں دلداری ایسی کہ میں نے اپنی بیس برس کی دوستی کی مدت میں ان کے خلاف کسی سے ایک لفظ نہیں سنا اور فرمان روائی ایسی کہ وہ اقلیم تحقیق و تنقید میں اپنا لوہا منواتے ہیں۔

ویسے پوچھیئے تو یہ تخلص فرمان خاصا عمر رسیدہ اور فرسودہ معلوم ہوتا ہے اب تو خیر میرے اور ان کے دونوں کے بالوں میں سفیدی آتی جا رہی ہے مگر اب سے بیس برس پہلے بھی یہ فرمان ہی تھے اور ماہ نامہ نگار کے مستقل لکھنے والوں میں۔ آج سے تقریباً اٹھارہ انیس برس پہلے کی بات ہے کراچی کی کسی ادبی محفل میں فرمان صاحب کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے محفل کے خاتمہ پر ایک بزرگ ادیب نے ان سے مصافحہ کیا اور بولے اچھا تو آپ ہیں۔ فرمان فتح پوری۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کی لمبی چوڑی داڑھی ہوگی۔ موصوف نے فرمان صاحب کو فارغ البال دیکھا تو انھیں مایوسی ہوئی۔ دراصل اگر وہ ان کے اندر جھانک کر دیکھتے تو بڑی سی لمبی سفید داڑھی ضرور نظر آتی۔ میں یہ داڑھی بیس برس سے دیکھ رہا ہوں۔ اسی داڑھی سے ڈر کر میں نے انھیں کبھی فرمان صاحب نہیں کہا۔ ہمیشہ دلدار بھائی کہا۔ دلدار اس لیے کہ اس سے میری "اپنائیت" کے جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ اور بھائی اس لیے کہ اس سے ان کی "فرمانیت" کی تسلی ہو جاتی تھی۔

فرمان صاحب کی تحریروں میں اور بھی خوبیاں ہیں لیکن جو چیز بہت نمایاں اور اہم ہے وہ یہ کہ فرمان صاحب وہ کچھ نہیں لکھتے جو دوسری کتابوں میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے انھیں بعض لوگ محقق کہتے ہیں لیکن ان کی تحقیق میں نہ تو حوالے پر حوالہ آتا ہے اور نہ بے سبب بال کی کھال نکالنے کا رجحان ملتا ہے۔ ان کا مضمون پڑھنے کے بعد قاری کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ پھر یہ کہاں کی تحقیق ہے تحقیق تو وہ ہے کہ ۱۱۱ صفحات میں یہ بحث کی جائے کہ فلاں واقعہ سن گیارہ میں ہوا یا سوا گیارہ میں یا ساڑھے گیارہ میں اور پھر خاتمہ مضمون پر برکت کے لیے لکھا ہو

"واللہ اعلم بالصواب"

بہر حال وہ اس قسم کے محقق نہیں ہیں۔ ان کی تحریریں دو خصوصیات کی حامل ضرور ہیں۔ پہلی یہ کہ ان کے مضامین کی اپنی ایک زندگی ایک چلت پھرت ہوتی ہے اس لیے ان کے یہاں وزن اور بوجھ کا احساس نہیں ملتا۔ ان کے مضامین ہانپتے نہیں تیز رفتار ہوتے ہیں توانائی اور زندگی ہیں بوجھ کا احساس نہیں ہوتا حرکت کا ہوتا ہے۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے ورنہ محققین کا علم دیکھ کر ناطقہ سر بہ گریبان ہونا تو کیا ناطقہ بند ہو جاتا ہے۔ بے چارہ ناطقہ ادھر فرمان صاحب کا یہ حال ہے کہ دو چار سیدھی سادی دلیلیں دیں اور مضمون ختم۔

خیر آپ انھیں محقق مانیے تو مانیے میں نہیں مانتا لیکن ایک بات آپ کو بتا دوں کہ صاحبِ موصوف ہر وقت قلم تیز رکھتے ہیں۔ اور کاغذ رنگنے کو تیار رہتے ہیں۔ آپ نے برسوں کی کاوش سے رباعی پر ایک مقالہ تیار کیا۔ اس مقالے پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل سکتی تھی۔ مگر آپ جانتے ہیں یونیورسٹی والے تین پاؤ کاغذ پر ڈگری نہیں دیتے پورے سوا سیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ رباعی بے چاری چار مصرعوں کی چیز اس میں زیادہ گنجایش نہ تھی اس لیے انھیں منظوم داستانوں کا موضوع لینا پڑا اور موصوف نے پورے پونے دو سیر کاغذ کالے کیے کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ ان سے کہوں دلدار بھائی اپنے ہمزاد فرمان فتح پوری سے کہیے کہ مجھے بھی ایک موٹا سا مقالہ لکھ دیں۔ یہ بات مجھے چپکے سے کہنی چاہیے تھی۔ زور سے کہہ بیٹھا۔ بہر حال زور سے کہنے میں بھی حسن طلب تھوڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔

دلدار بھائی فطرتاً بہت خوش باش انسان ہیں ان کے ساتھ کچھ وقت گزاریے تو پتہ چلے گا کہ کراچی میں بیس بائیس برس رہنے کے باوجود زندگی کی لذت اور ذائقے میں مطلق فرق کیوں نہیں آیا۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب کراچی کی ہماہمی شور و شغب اور ہنگامہ نے مجھے بکھیر دیا تھا مگر میں روز بکھرتا تھا اور روز ہی مجتمع ہو جاتا تھا۔ اس کا باعث دلدار بھائی تھے۔ انھیں زندگی نے وہ قوت اور توانائی بخشی ہے جو وہ محض اپنے لیے نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کو تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن چیز بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے مگر دلدار بھائی شاید شکست خوردہ ذہنوں کی مرمت کا انجینئرنگ کورس اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ہی پاس کر کے آئے ہیں۔ چناں چہ وہ مجھے ہر ممکن طور پر مرمت کر کے کھڑا کر دیتے تھے میرے ماضی کی اندھیری یادوں میں دلدار بھائی کا ایک ایک جملہ ستاروں کی طرح جگمگاتا ہے۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگے۔ اس صدی کے نصف اول میں نیاز فتح پوری نے فراق گورکھپوری کا سراغ لگایا تھا اور اس کے نصف ثانی میں میں نے تمہیں دریافت کیا ہے۔ خیر ان کی اس بے ڈھب پیش گوئی پر پورا اترنا تو شاید میرے بس کی بات نہیں لیکن یہ ضرور ہوا کہ میں نے حتی الامکان یہ کوشش ضرور کی کہ دلدار بھائی خود اپنے آپ سے شرمندہ نہ ہوں۔

دلدار بھائی اور میں زندگی کے ایک ایسے موڑ پر اکٹھے ہوئے تھے جب ہم دونوں ہی کے پاس چند امنگوں اور آرزوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا لیکن ان کا کام زیادہ کٹھن تھا کہ وہ انتھک محنت و کاوش کے باوجود میری دلبستگی کا کام بھی کرتے تھے۔ ہم دونوں مختلف اسکیمیں بناتے تھے کچھ کاوش بھی کرتے تھے لیکن کوئی کام تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ اس کی وجہ محض یہ ہوتی تھی کہ اسکیم بنانے میں میں ان سے زیادہ تھا لیکن کام کرنے میں ان سے بہت پیچھے اور دلدار بھائی اپنا کام کرتے رہے۔ اب بھی کر رہے ہیں۔ اور خدا جانے میرے جیسے کتنے لوگوں کے لیے تقویت کا باعث ہیں۔ میں دو چار ایسے اشخاص کو جانتا ہوں جو ان کے خلوص و محبت کے جال میں پھنس کر ایم اے کر چکے ہیں۔

دلدار بھائی محض ادیب نہیں ہیں ادیب گر بھی ہیں۔ لوگوں کو گھیرنا۔ نگار کے لیے مضامین لکھوانا اور

سب سے بڑی بات جوہر قابل کی تلاش کرنا ان کے دلچسپ مشغلے ہیں۔ تلاش تو خیر اور لوگ بھی کر لیتے ہوں گے مگر یہ حضرت جوہر کے لیے عرض مہیا کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ نرے ادیب ہوتے تو یہ بھی کب کے ٹھکانے لگ چکے ہوتے۔ ویسے بھی کراچی جیسے شہر میں رہ کر قلم چلانا اور چلاتے رہنا مضبوط اعصاب والے ہی کا کام ہے اور جب دلدار بھائی سے ملتا ہوں اور بیس برس پہلے والی لہجہ کی کھنک اور چھوٹی چھوٹی معصوم باتوں کے ساتھ قہقہے سنتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ کہیں اس شخص کی کھال کے نیچے رگ وپٹھے لوہے کے تو نہیں بنے ہیں۔

دلدار بھائی نے فرمان والی "بزرگی" کے ساتھ "دلدار" والی معصومیت کو اس طرح پہلو بہ پہلو رکھا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ اندر کا یہی بچپن اور معصومیت انھیں تخلیقی انسان بننے پر مجبور کرتی ہے ورنہ کراچی میں ان جیسے آدمی کے لیے مواقع بہت تھے اور یہ دن بھی آسکتا تھا کہ نہ دلدار بھائی سے ملاقات ہوتی نہ فرمان صاحب سے بلکہ میرے سامنے سیٹھ فرمان فتح پوری والا بیٹھے ہوتے بلکہ یوں کہیے کہ میں ان کے سامنے کھڑا ہوتا۔

دلدار بھائی کے اندر مجھے ایک چھپا ہوا شاعر بھی ملا ہے۔ میں نے ان کے شعر کبھی نہیں سنے مگر مجھے یقین ہے کہ ان کا شاعر ان کے محقق اور ناقد کے ڈر سے کہیں اندر چھپ گیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو ایک بار ایران کے سفیر کسی تقریب پر ہمارے کالج آئے۔ چند ایسے طلبہ کی ضرورت تھی جو سفیر صاحب کو فارسی کے شعر سنائیں۔ میں نے ساتویں اور آٹھویں جماعت میں فارسی پڑھی تھی اور یہی میری کل متاع تھی بہر حال میں بھی فارسی غزل کہنے پر تیار ہو گیا۔ اس غزل پر اصلاح دلدار بھائی نے کی تھی۔ کراچی میں جو شعر کہتا سب سے پہلے انھیں سناتا تھا۔ وہ مجھے بہت اچھے مشورے بھی دیتے تھے اور اب جب کہ میں دو چار شعر کہہ لیتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ اس میں دلدار بھائی کا کتنا حصہ ہے اور میری ذاتی کاوش کو کتنا دخل تو ہمیشہ خود کو گھاٹے میں پاتا ہوں۔

اتنے نفیس ذوق شعر کے حامل ہوتے ہوئے بھی وہ جب کبھی ثقیل مضامین لکھتے ہیں تو اور بھی تعجب ہوتا ہے۔ تاہم یہ سوچ کر چپ ہو جاتا ہوں کہ آخر نیاز فتح پوری اور مولانا غلام رسول مہر کا سلسلہ بھی تو قایم ہے۔ غالب شاعر امروز و فردا غالب کو بھی خراج تحسین ہے اور فرمان صاحب کی اپنی کاوشوں کو بھی وہ ہمیشہ سے غالب پرست اصحاب کے طرف دار ہیں۔ لیکن اعلا ذوق شعر رکھنا اور غالب کی طرف داری کرنا دونوں ایک ہی بات ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کی جتنی گرہیں کھولی ہیں وہ واقعی ہمارے جیسے طالب علموں کو صحیح قسم کی غالب فہمی کی طرف اشارہ ہیں۔ مگر فرمان فتح پوری چپ بیٹھنے والے آدمی نہیں ہیں۔ آپ کچھ دنوں میں دیکھیں گے کہ انھوں نے غالب کی وہ گانٹھ بھی کھول دی جو اس نے خود سر رشتہ تقدیر میں دے رکھی تھی۔ میں دلدار بھائی سے کہوں گا کہ فرمان صاحب کو یہ ضرور یاد دلا دیں کہ وہ غالب کی گاڑی ہوئی کیل کو نہ بھولیں جو اس نے بن ناخن تدبیر میں گاڑ رکھی ہے۔

پروفیسر نذیر علوی

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی شخصیت پر ایک نظر

شخصیت یا PERSONALITY یونانی زبان کا لفظ ہے۔ قدیم دور میں جب ڈرامے اسٹیج ہوا کرتے تھے تو اداکار منہ پر نقاب VIEL یا PERSONA ڈال کر اس کے پیچھے سے بولتے تھے۔ یہیں سے لفظ شخصیت PERSONALITY نکلا ہے۔

انسان کی ایک ظاہری شخصیت ہوتی ہے جس میں انسان کی شکل وصورت، لباس، انداز گفتگو وغیرہ شامل ہے۔ لیکن اس سے کہیں بڑھ کر انسان کی باطنی شخصیت ہوتی ہے جو پوشیدہ ہوتی ہے اور یہی انسان کی اصلی شخصیت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جتنا باہر سے نظر آتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر وہ اندر سے گہرا اور پھیلا ہوا ہوتا ہے جو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے باطن کو ہمیشہ چھپائے رکھتا ہے۔ اس باطنی شخصیت پر ظاہری شکل وصورت بھی اثر انداز ہوتی ہے کیوں کہ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ کوئی شخص باہر سے جتنا حسین ہوگا اس کا دل بھی اتنا ہی حسین ہوگا۔ اگرچہ یہ ہر شخص پر منطبق نہیں ہوتی پھر بھی اس بات کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی ظاہری شخصیت بھی اس کی باطنی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان کی ظاہری شخصیت کے بارے میں حکیم نثار احمد علوی لکھتے ہیں۔

> "میانہ قد، جسم دبلا نہ موٹا، لیکن دقت کسرتی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا، چوڑی ابھری پیشانی، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، بیلدار لکھنوی کرتہ زیب تن اور پاجامہ علی گڑھ کی روایت کا غماز، غالباً دوپلی ٹوپی بھی پہنتے ہوں گے۔ اگرچہ اس وقت سر پر نہ تھی۔ غرض لباس سے اودھ کی چھاپ ظاہر تھی چہرہ پر غور وفکر کے آثار بھی نمایاں تھے۔ فرمان صاحب قہقہہ خوب لگاتے ہیں اور ان کی گفتگو میں طنز ومزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر طبقے کے پسندیدہ محبوب ہیں"[1]

بحیثیت معلم

نفسا نفسی اور خود غرضی کے اس دور میں جہاں انسان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، وہاں انسان کا تشخص بھی مجروح ہوا ہے۔ اس دور میں انسان اپنے آپ کو بالکل تنہا اور اکیلا محسوس کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات انسان کا اپنے اوپر سے بھی اعتماد اٹھ جاتا ہے اور اس پاپ کی بستی میں اور اس دکھوں کے گھر میں انسان کو اپنا وجود بھی کبھی بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ جہاں ہر طرف مصائب ہی مصائب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کا اعتماد اپنے اوپر سے اٹھ جائے تو اس کی شخصیت بکھر اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اگر ایک

---

[1] شب چراغ از حکیم نثار احمد علوی مطبوعہ کاکوری اکیڈمی ناظم آباد کراچی۔ ص ۴۷

لمے کے لیے بھی کسی شفیق انسان کی محبت اور ہمدردی میسر آجائے تو غنیمت ہے۔ کوئی شفقت اور محبت کے دو بول بھی کہہ دے تو ایسا لگتا ہے جیسے تھکے ماندے مسافر کو سفر میں چلتے چلتے جب کہ اس کا پیاس کے مارے برا حال ہو، نہایت ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ نظر آجائے اور وہ اس چشمے میں سے سیر ہو کر پانی پیے اور پھر کسی گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنے کے لیے لیٹ جائے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایسے ہی شخص ہیں جن کی ہمدردی اور شفقت دوسروں کا دل موہ لیتی ہے اور ناآسودہ دلوں کے لیے سکون و قرار کا باعث بنتی ہے۔ وہ دسویں جماعت کا امتحان دینے کے بعد ۱۹۴۶ء میں مدرسہ اسلامیہ ہائی اسکول فتح پور میں استاد بنے اور پھر تدریس کا یہ مشغلہ پوری زندگی اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالاں کہ انھیں ۱۹۴۸ء میں اپنے دوست شباہت علی خاں کے ساتھ برٹش کونسلیٹ میں ملازم ہو کر مشہد (ایران) جانے کا موقع بھی ملا لیکن وہ اپنے آپ کو وہاں ایڈجسٹ نہ کر سکے اور تین چار ماہ بعد ہی واپس فتح پور آ گئے اور پھر سے مولوی محمد اسحاق کے مدرسہ اسلامیہ ہائی اسکول فتح پور میں مدرس بن گئے۔

۱۹۵۰ء میں فرمان صاحب ہجرت کر کے کراچی آئے۔ جہاں انھیں آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں ڈویژنل اکاؤنٹنٹ کی ملازمت مل گئی لیکن وہ اس سسٹم سے بھی مطمئن نہ ہو سکے اور ۱۹۵۴ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اگرچہ اس ملازمت سے مستعفی ہونے کے لیے انھیں حضرت جوشؔ صاحب اور اکاؤنٹنٹ جنرل سے سفارشیں بھی کروانا پڑیں۔

۱۹۵۵ء میں وہ کراچی کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں بی ٹی ٹیچر بن گئے اور ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے بطور لیکچرار منسلک ہو گئے۔ اسی شعبے میں وہ پروفیسر اور چیئرمین بھی رہے، ۱۹۸۵ء میں انھیں اردو ڈکشنری بورڈ کا چیف ایڈیٹر اور سکریٹری مقرر کیا گیا اور وہ آج تک اس منصب پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر فرمان کی شخصیت کا روشن ترین پہلو ان کا پیشۂ معلمی ہے جہاں وہ ایک مکمل استاد نظر آتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور عربی، فارسی، انگریزی اور اردو جیسی زبانوں پر انھیں عبور حاصل ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل استاد شعبۂ اردو جامعہ کراچی ڈاکٹر فرمان کے شاگرد رہے ہیں اور انھیں کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر فرمان کے ساتھ کام کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ وہ ڈاکٹر فرمان کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "میں نے ڈاکٹر صاحب سے مستقل کم از کم دو سال تک ایم۔ اے (اردو) جامعہ کراچی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنی طالب علمی کے اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب پورے شعبے کے تمام طالب علموں کے سب سے محبوب، مقبول اور پسندیدہ استاد رہے ہیں۔ یہ ان کی بحیثیت استاد مقبولیت تھی۔ کوئی طالب علم ان کی کلاس سے غیر حاضر نہ رہنا چاہتا تھا اور سب سے زیادہ حاضری انھی کی کلاس میں رہتی تھی:

ڈاکٹر صاحب کا طریق تدریس نہایت شگفتہ اور معلومات افزا تھا۔ خشک سے خشک موضوع جیسے عربی و فارسی قواعد بھی اگر وہ پڑھاتے تو نہایت پُر بہار اور شگفتہ انداز میں پڑھاتے تھے کہ ہر بات طالب علموں کے ذہن نشین ہو جاتی تھی۔ درمیان میں پُر لطف حکایتیں اور لطائف بھی درس کا حصہ بنتے رہتے تھے۔ اگر تنقید جیسے موضوع پر اظہار خیال یا لیکچر ہوتا تو بھی یہی انداز گفتگو رہتا۔ کسی شاعر کو موضوع بنایا جاتا تو اس کے اور دیگر شعرا کے اشعار کو بکثرت بطور مثال بیان کرتے رہتے۔ اپنے ہر لیکچر میں ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں کو بھی

ساتھ ساتھ لے کر آگے بڑھتے تاکہ ہر طالب علم لیکچر کو ذہن نشیں کرتا ہے اور اس کا ذہن موضوع سے خود بخود مطابقت پیدا کرتا رہتا۔" لے

بحیثیت خاوند

ڈاکٹر فرمان کی ۱۹۴۷ء میں اپنی خالہ زاد بہن سلمیٰ بیگم بنت مصاحب علی سے شادی ہوئی۔ یہ ان کے اپنے پسند کی شادی ہے۔ سلمیٰ بیگم صاحبہ نے پی ٹی سی تک کی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے لیکن انھوں نے ملازمت اختیار نہیں کی حالاں کہ ڈاکٹر فرمان کی طرف سے ان کو اجازت تھی کہ اگر وہ چاہیں تو ملازمت کر لیں لیکن سلمیٰ بیگم کے نزدیک بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کرنا بھی ایک ملازمت ہی ہے۔

ڈاکٹر فرمان بڑے مصروف آدمی ہیں۔ رات دن، صبح و شام علمی و ادبی کاموں میں صرف ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک اچھے شوہر ہیں۔ بقول بیگم صاحب:

> "فرمان صاحب اگرچہ دن رات، صبح و شام مطالعے میں مصروف رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بچوں کی نگہ داشت اور گھریلو معاملات میں بھی خاصی دل چسپی لیتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے لیے صرف ایک باپ ہی نہیں بلکہ ایک دوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرمان صاحب سے مجھے وہ سب کچھ ملا ہے جو ایک اچھے شوہر سے توقع کی جا سکتی ہے۔" ۲ے

بحیثیت باپ

ڈاکٹر فرمان کے چھ بچے ہیں جن میں سب سے بڑے سید ابرار علی ہیں جو (K.E.S.C) کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں ڈپٹی چیف انجینیر ہیں۔ ان سے چھوٹی بیٹی شمیم سلمان ہیں جو آج کل اپنے شوہر کے ساتھ نیویارک میں ڈاکٹر ہیں۔ ان سے چھوٹی بیٹی نجمہ فرمان ہیں جو کراچی یونیورسٹی میں شعبہ سوشل ورک کی استاد ہیں۔ نجمہ سے چھوٹے بیٹے سید ابصار علی ہیں جو ڈاکٹر ہیں اور نیویارک میں مقیم ہیں۔ ابصار علی سے چھوٹی بیٹی وسیم فرمان ہیں جو کراچی کے ہسپتال میں ہی ڈاکٹر ہیں اور سب سے چھوٹی بیٹی عظمیٰ فرمان ہیں جو آج کل مقامی کالج میں بی۔ ایس سی (B.SC.) کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کی بیوی سلمیٰ بیگم سے جب پوچھا گیا کہ فرمان صاحب کا بچوں کے ساتھ کیسا رویہ ہے تو انھوں نے کہا:

> "فرمان صاحب کا علمی، ادبی اور سماجی کاموں سے جو وقت بچتا ہے وہ اکثر دعوتوں میں گزرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ گھر کے معاملات اور بچوں کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے مجھ سے زیادہ ان سے محبت کرتے ہیں۔
> ہمارے بچوں کو تو خیر ان سے محبت کرنا ہی چاہیے حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر بچے کے پسندیدہ

لے ڈاکٹر معین الدین عقیل کا خط بنام راقم الحروف مورخہ ۳۰ ۔۔۔
۲ے سلمیٰ بیگم سے راقم الحروف کی ایک ملاقات مورخہ ۲۷ ۔۔۔

شخص ہیں۔ وہ بچوں کو دلچسپ کہانیاں، لطائف اور اشعار خوب سناتے ہیں۔ جب وہ بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوں تو بڑے بے تکلف ہوتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی بچے ہیں۔[1]

بحیثیت منتظم

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نیاز فتح پوری کے رسالے "نگار" میں ۱۹۶۲ء سے بطور نائب مدیر کام کرنا شروع کیا۔ ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو علامہ نیاز فتح پوری نے رحلت فرمائی اور نیاز صاحب کی وفات کے بعد اس رسالے کی تمام تر ذمہ داری ان پر عاید ہوگئی اور وہ مدیر اعلیٰ بن گئے۔ ان کی سرپرستی میں اس رسالے نے تحقیقی و تنقیدی دنیا میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں جس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۶۲ء سے اب تک درجنوں سالنامے اور خاص نمبر شایع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے چیرمین بھی رہے ان کے انتظامی امور کے سلسلے میں ڈاکٹر معین الدین رقم طراز ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کو بحیثیت منتظم یا بطور صدر شعبہ تقریباً ڈیڑھ سال تک دیکھا اور ان کے ماتحت کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے دور میں شعبہ انتظامی لحاظ سے بہت باقاعدہ رہا۔ تمام معاملات شعبہ اردو روز کے روز اور خوش اسلوبی سے انجام پاتے۔ ڈاکٹر صاحب شعبہ میں تمام اساتذہ سے پہلے پہنچتے اور بالعموم سب کے بعد واپس گھر جاتے۔ اس طرح سارا وقت شعبہ یا یونیورسٹی میں موجود رہتے۔"[2]

اور ان کے اسی اعلا انتظام کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے فروری ۱۹۸۵ء سے لے کر اپریل ۱۹۸۶ء تک چیرمین شعبہ اردو، جامعہ کراچی کے علاوہ اردو ڈکشنری بورڈ کا عارضی انتظام بھی انہی کے سپرد کر دیا پھر وہ مستقل طور پر اردو ڈکشنری بورڈ میں بحیثیت مدیر اعلیٰ منسلک ہو گئے اور آج کل اسی عہدے پر فائز ہیں۔ اردو ڈکشنری بورڈ کے مدیر مرزا نسیم بیگ لکھتے ہیں:

"بحیثیت منتظم ڈاکٹر صاحب میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ خوبی یہ ہے کہ وہ نرم طبیعت کے آدمی ہیں اور معاملات پر سخت گیر رویہ نہیں رکھتے اور نہ ہی بات بات پر گرفت کرتے ہیں بلکہ درگزر سے کام لیتے ہوئے معاملے کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں تاکہ بھلے مانس کی طرح متعلقہ شخص خود ہی اپنی اصلاح کرلے اور اس کو سنبھلنے کا موقع مل سکے۔ ہاں جب کڑا وقت آپڑے اور درگزر کی گنجائش باقی نہ رہے تو پھر مواخذہ کرتے ہیں اور ضابطہ کی کاروائی میں رو رعائت نہیں رکھتے۔ اس رویہ سے کچھ لوگ فایدہ اٹھاتے ہیں جس سے ڈسپلن (DISCIPLINE) برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے اور یوں یہ خوبی خامی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کامیاب منتظم کو کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ساتھ ساتھ مواخذہ بھی ہوتا رہے۔ گویا ڈسپلن کے لیے جزا اور سزا دونوں میں اعتدال رکھنا ضروری ہے۔۔۔۔ یوں تو فی زمانہ تھوڑا بہت تضاد ہر شخص کے قول و فعل میں ملتا ہے لیکن

---

[1] سلمیٰ بیگم سے راقم الحروف کی ایک ملاقات مورخہ ۲۷ ۸۸ء

[2] ڈاکٹر معین الدین عقیل کا خط بنام راقم الحروف مورخہ ۳۰ ۸/۱۹۸۸

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ظاہر اور باطن میں کوئی تضاد نہیں ۔ ان کی شخصیت جیسی ظاہر میں نظر آتی ہے ویسی ہی باطن میں بھی ہے۔ ان کے باطن میں کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں ملتی۔ نہ ہی ظاہری طور پر تصنع و بناوٹ اور رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت مجموعی طور پر ایک فعال اور کامیاب شخصیت ہے انھوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کی ہے۔ جو خوش اخلاقی، خلوص نیت، محنت، لگن اور ان تھک محنت اور جد وجہد سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے کیا۔ پھر مسلسل محنت اور لگن سے تعلیم کے حصول میں لگے رہے۔ بالآخر انھوں نے بہت سی اسناد اور پھر بڑی بڑی ڈگریاں بھی حاصل کرلیں ساتھ ہی ساتھ انھوں نے لکھنے پڑھنے کا کام بھی جاری رکھا۔ اس طرح ایک طویل جد وجہد کے بعد انھوں نے اپنی منزل پالی۔ آج بلاشبہ ان کا شمار ملک کی بڑی شخصیات میں ہوتا ہے اور وہ زبان و ادب میں بھی ایک سربرآوردہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت نوجوانوں کے لیے ایک نمونہ ہے جو انھیں حوصلہ اور ہمت دلانے کے لیے کافی ہے۔"[۱]

بحیثیت بھائی

ڈاکٹر فرمان کل پانچ بہن بھائی ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کا نام سید اشفاق علی تھا جن کا عین عالم شباب میں ہیضے کی وبا سے انتقال ہوگیا۔ جس کے غم سے ہی فرمان کے والد سید عاشق علی ۱۹۳۳ء میں فوت ہوئے۔ ڈاکٹر فرمان کے دوسرے بھائی کا نام شمشاد علی تنہا ہے کراچی میں ہیں اور ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ ان کی ایک بہن بھی بقید حیات ہیں اور الہ آباد (ہندوستان) میں رہتی ہیں۔[۲]

ڈاکٹر فرمان اپنے تمام بہن بھائیوں سے چھوٹے ہیں اس لیے قدرے ناز و نعم میں پلے۔ جب راقم الحروف نے ان کے بھائی شمشاد علی تنہا سے ڈاکٹر فرمان کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا:

"ہجرت سے قبل ہندوستان میں ابتدائی تعلیم سے لے کر گریجویشن تک اور تقسیم ہند کے بعد کچھ عرصہ پاکستان میں ڈاکٹر فرمان صاحب کی زندگی کے ایام تنگ دستی میں گزرے ہیں۔ میں نے بڑے بھائی کی حیثیت سے ہر وہ کام کیا جو ایک بھائی کو کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹر فرمان نے مجھے اس کا صلہ یوں دیا کہ تقسیم ہند کے بعد سب سے پہلے فرمان صاحب ہی پاکستان تشریف لائے اور تقریباً دو سال کے بعد ہمیں بلوالیا چنانچہ میں بال بچوں سمیت پاکستان آگیا اور ملیر سٹی میں جہاں ہمارے بھائی نے ماڈل نائٹ ہائی اسکول کھول رکھا تھا، اسی گھر میں رہنے کو جگہ ملی۔ انھوں نے ہمارے بڑے بیٹے کو تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا۔"[۳]

اردو کے نامور صحافی اور ادیب ابن حنیف صاحب کی بیوی فہمیدہ بانو ڈاکٹر فرمان کی منہ بولی بہن ہیں۔

---

[۱] اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے نائب مدیر مرزا نسیم بیگ کا خط بنام راقم الحروف مورخہ ۲۱ ۸۸/۸

[۲] ۱۹۸۹ء میں وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں

[۳] شمشاد علی تنہا سے کراچی میں راقم الحروف کی ملاقات مورخہ ۲۷ ۸۹/۱

ڈاکٹر فرمان سے ان کے ۳۸-۳۹ سال پرانے تعلقات ہیں۔ فہمیدہ بانو کے بھائی ڈاکٹر مشتاق حسین جو کہ آج کل شکاگو میں ہارٹ سپیشلسٹ ہیں، ڈاکٹر فرمان کے چہیتے شاگرد رہے ہیں۔ فہمیدہ بانو کے تعلقات کی وجہ بھی شاید یہی ہے۔ راقم الحروف کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے فہمیدہ بانو نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب میرے بھائی ہیں۔ وہ میرے ہر دکھ اور سکھ میں برابر کے شریک رہے ہیں جس کی واضح مثال میری والدہ صاحبہ کی موت پر ان کا سلوک ہے۔ وہ نہ صرف ہمارے گھر میں کام کاج میں مصروف رہے بلکہ بہت سارے مہمانوں کو بھی اپنے گھر لے گئے۔

وہ بڑے مذہبی ہیں لیکن ان کے ہاں تعصب نہیں ہے۔ مزاج کے نرم اور ہنس مکھ ہیں۔ طبیعت میں بناوٹ اور تصنع نہیں بلکہ سادگی ہے۔ وہ خود بھی ہنسی مذاق کرتے ہیں اور دوسرے کے ہنسی مذاق سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کی شادی کے دن کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر فرمان صاحب دولہا بنے بیٹھے تھے کہ ان کی رسم کے مطابق ان سے ڈش کا ڈھکنا کھلوایا گیا لیکن جوں ہی انھوں نے ڈھکنا کھولا۔ اس میں سے کئی چڑیاں اڑ گئیں۔ ڈاکٹر صاحب آج بھی اس واقعہ کو بڑے مزے لے کر سناتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا اور یہی سمجھتی ہوں کہ فرمان صاحب اور غصہ دو متضاد چیزیں ہیں"[1]

احباب

ڈاکٹر فرمان کے احباب کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس فہرست میں ہر عمر کے لوگ شامل ہیں جس کی وجہ ان کی ہنس مکھ عادت ہے۔ وہ کسی کی بات کا کبھی بھی برا نہیں مناتے۔ یہاں ڈاکٹر فرمان کے چند احباب کی رائے تحریر کی جاتی ہے۔

مرزا ابنِ حنیف

مرزا ابنِ حنیف (ظریف بیگ) پاکستان کے معروف محقق ہیں۔ روزنامہ امروز، ملتان میں سینئر سب ایڈیٹر ہیں۔ تینتیس ۳۳ چونتیس ۳۴ سال سے ڈاکٹر فرمان کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔ ڈاکٹر فرمان سے ان کی پہلی ملاقات کوئٹہ میں ہوئی۔ ان کے متعلق مرزا ابنِ حنیف کہتے ہیں:

"میں کسی شخص سے زیادہ تعلقات نہیں بڑھایا کرتا لیکن ڈاکٹر فرمان صاحب آدمی ہی ایسے تھے جس نے مجھ پر پہلی ملاقات میں ہی جادو کر دیا۔ آہستہ آہستہ یہ تعلقات مزید بڑھے اور میں جب بھی ان سے ملا، تو اسی خواہش سے کہ اُن سے کچھ سیکھوں کیوں کہ وہ علم کے جن ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی گفتگو چاہے علمی ہو یا ادبی یا ہنسی مذاق کی، اس میں ایک عالمانہ شان موجود ہوتی ہے۔ ان کی باتوں میں اتنی شگفتگی ہوتی ہے کہ ان کی گفتگو ایک جاہل، عالم، کم پڑھا لکھا، طالب علم کسی پر بھی گراں نہیں گزرتی۔ وہ اپنی عام گفتگو میں بھی اشعار اور محاورات وغیرہ استعمال

---

[1] فہمیدہ بانو سے راقم الحروف کی ایک ملاقات بتاریخ ۱۳ اگست ۱۹۸۸ء

کرتے رہتے ہیں۔ گویا ان کی علمی اور ادبی اور مذاحیہ گفتگو میں ایک رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ مذہب اور پاکستان سے انھیں بے حد محبت ہے اور وہ دوسرے لوگوں کی طرح بیرون ملک جاکر پاکستان اور پاکستانی قوم کو بُرا بھلا نہیں کہتے بلکہ وہ اپنی محبت کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ پاکستان اور اس کے لوگوں سے خصوصاً نوجوانوں سے انھیں بے حد محبت ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ یہاں کے نوجوان فضول وقت ضائع کرنے کے بجائے کوئی اچھا کام کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کریں اس لیے وہ اپنے ملنے والے نوجوان کو کبھی پیار سے، کبھی دھمکا کر اور کبھی غصّے سے کام کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ خوبی بلاشبہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو علم پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

وہ دوسروں سے بہت کم ناراض ہوتے ہیں لیکن تنگ نظر لوگوں سے اُن کی ہمیشہ اَن بن رہتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا سکتا ہے کہ ایک بار رات کے وقت ان کے کسی قریبی دوست نے انھیں کہا کہ فلاں صاحب پر مضمون لکھ کر اس کے بخیے ادھیڑ دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر غصہ میں آگئے اور رات ایک بجے تک اسی موضوع پر بحث کرتے رہے۔"[1]

ڈاکٹر احسان الحق اختر

ڈاکٹر احسان الحق اختر گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی زیر نگرانی پی ایچ۔ ڈی (PH.D.) کی ہے۔ میرے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

"ڈاکٹر صاحب جب کچھ سمجھاتے تو بڑی بے تکلفی سے کام لیتے جس سے ڈر اور خوف کی بجائے محبت اور بے تکلفی بڑھتی۔ وہ میرے سوالوں سے بے حد خوش ہوتے لیکن وہ تنظیم کا خاص خیال رکھتے کیوں کہ انھیں ادبی بد تمیزی پسند نہیں ہے۔ آپ بے شک ان کے قریبی دوست ہی کیوں نہ ہوں، اگر آپ نے آداب کا خیال نہ رکھا تو وہ آپ کو ڈانٹ دیں گے۔

مذہبی لحاظ سے وہ بڑے پختہ عقیدے کے مالک ہیں۔ جب یہاں (لاہور) آتے ہیں تو حضرت داتا گنج بخش صاحب کے مزار پر ضرور جاتے ہیں۔ اب تو وہ عمرہ بھی کر آئے ہیں لیکن ان کے جانے اور آنے کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔ گویا وہ ریاکاری سے پرہیز کرتے ہیں۔ جہاں تک دوستی کا تعلق ہے وہ اپنے کسی دوست پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتے۔ ایک دفعہ شادی کے موقع پر اپنی بیٹی نجمہ فرمان جو کراچی یونیورسٹی کے شعبہ سوشل ورک کی پروفیسر ہیں، کو ہمارے ہاں بھیجا اور ہمیں فون کیا کہ آپ فلاں پبلشر صاحب سے اتنی رقم لے کر نجمہ کے رہنے کے لیے کسی اچھے سے ہوٹل میں انتظام کر دیں لیکن اس رقم کا نجمہ کو علم نہ ہو۔ ہم اگرچہ انکار کرتے رہے لیکن جب انھوں نے سختی سے ڈانٹ کر کہا تو بات ماننا ہی پڑی۔"[2]

---

[1] مرزا ابن حنیف سے ایک انٹرویو بتاریخ ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء

[2] ڈاکٹر احسان الحق اختر سے راقم الحروف کی ایک ملاقات مورخہ ۲۰ ۸ ۱۹۹۹

پروفیسر عرش صدیقی

عرش صدیقی بہاالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے رجسٹرار ہیں اور ملک کے معروف نقاد، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے فرمان کی شخصیت کے بارے میں کہا:

"مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی بہر حال اتنا ضرور یاد ہے کہ ملاقات بہت پرانی ہے۔ پہلے قلمی ملاقات اور پھر بالمشافہ۔ ہم تقریباً ہم عمر ہیں بلکہ میری عمر ڈاکٹر صاحب سے ایک آدھ برس زیادہ ہے۔ اس لیے ہماری دوستی برابری کی بنیاد پر قائم ہوئی اور اسی بنیاد پر قایم ہے۔ وہ ایک حلیم طبع، کشادہ دل، کشادہ رو اور کشادہ ذہن معلوم ہوئے اور یہ حقیقت ثابت بھی ہو گئی۔ ان کی یہی خوبی کہ وہ کشادہ دل اور کشادہ ذہن، مجھے ہمیشہ متاثر کرتی رہی ہے: بحیثیت دوست وہ بے حد مہربان آدمی ہیں۔ جن باتوں پر عام لوگ ناراض ہو جاتے ہیں وہ ان باتوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے اور ان میں خامی یہ ہے کہ وہ ہر وقت مجھے "کام کرو، کام کرو" کہہ کر تنگ کرتے اور ستاتے ہیں۔ لیکن جب میں ان کے تجویز کردہ کام نہیں کر پاتا تو وہ ناراض بھی نہیں ہوتے۔"[1]

سجّاد باقر رضوی

سجاد باقر رضوی کا شمار پاکستان کے مشہور نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ آج کل اورنٹیل کالج، لاہور میں شعبہ اردو کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر فرمان کے متعلق بتایا:

"ہماری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب ہم دونوں اے۔ جی آفس کراچی میں اکٹھے کام کرتے تھے وہ ڈویژنل اکاؤنٹنٹ تھے اور میں اپر ڈویژن کلرک تھا۔ لوگوں کے دلوں میں ان کا بے حد احترام تھا یہی وجہ تھی کہ بہت سے لوگ انھیں بھائی کہتے تھے جن میں ایک میں تھا حالاں کہ وہ مجھ سے صرف دو سال بڑے ہیں لیکن ان کی بزرگی کا رعب پندرہ بیس سال زیادہ ہے۔ بطور بھائی وہ بڑے شفیق ہیں اور جب بھی میں تعلیم کے سلسلے میں ڈانواں ڈول ہوا انھوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ وہ میرے اشعار سنتے اور داد دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ میرا پی ایچ ڈی کرنا ان کے بغیر ناممکن تھا کیوں کہ وہ خود محنتی ہیں اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ محنت اور محبت دونوں لفظ جس طرح لکھے ایک طرح ہی جاتے ہیں اسی طرح دلدار بھائی اس کو ایک ہی جانتے ہیں۔ ان کا یہی پیغام ہے کہ:

عشق میں کیا کام ہے نازک مزاجی کے تئیں ـــــ ـــــ
کوہ کن کی طرح سے جی توڑ کر محنت کرو

ڈاکٹر صاحب وہ فرہاد ہیں جنھوں نے محبتوں کے چراغ جلائے اور ان کی محبتوں کی

---

[1] پروفیسر عرش صدیقی سے انٹرویو مورخہ ۱۶ ۹/ ۱۹۸۹

روشنی میں میرے جیسے لوگ پروان چڑھے۔

اصل دوست وہ ہوتا ہے کہ آپ جب اسے یاد کریں تو آپ کا دل بھر جائے۔ میری زندگی میں ایسے دو تین آدمی ہیں جن میں فرمان صاحب بڑے اہم ہیں۔ ان کی یاد سے میرا دل خوشیوں سے بھر جاتا ہے۔ مذہب کے حوالے سے میرا خیال ہے کہ اگر ایسے ہی دس بیس آدمی اور پیدا ہو جائیں تو یہ فرقہ وارانہ مسئلے ختم ہو جائیں گے۔ کیوں کہ ان کا سبق یہی ہے کہ محنت اور محبت کو اپنانا چاہیے اور ان کا یقین ہے کہ محبت، محنت اور علم یہ تینوں زندگی کے سرچشمے ہیں اور زندگی پر ان ہی کی حکومت ہونی چاہیے اور حقیقتاً فرمان صاحب نے ان تینوں چشموں سے جی بھر کر پیاس بجھائی ہے۔ اسی لیے زندگی پر بھی اور ہمارے جیسے لوگوں کے دلوں پر بھی ان کی حکومت ہے۔"[1]

---

[1] سجاد باقر رضوی سے راقم الحروف کا ایک انٹرویو مورخہ ۲۲ ۸ ۱۹۸۸

امراؤ طارق

گیان کا درخت دعا کی چھاؤں

شہزادہ سدارتھ کپل وستو کے محل سے راج پاٹ تج کے نکلے تو دل دنیا کے موہ سے خالی اور بیماری، موت اور بڑھاپے کے دکھوں سے بھرا ہوا تھا انھیں نہ بیوی کی محبت روک سکی اور نہ بچے کا پیار اُن کی راہ میں حائل ہو سکا۔ وہ گیان کی تلاش میں نکلے تھے سو، اس وقت تک چلتے رہے جب تک وہ گیا نہ پہنچ گئے جہاں برگد کے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں جس کی شاخیں چھوں اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور جس کی جٹائیں زمین پر جھول رہی تھیں آدمی چرند اور پرند سب ہی کو پناہ ملتی اور سب ہی فیض پاتے تھے۔ میں نہ شہزادہ تھا نہ راجکمار مگر میرا گاؤں شاہ پور میرا کپل وستو ضرور تھا اور میں نے راج پاٹ تو نہ چھوڑا تھا مگر شاہ پور کی گلیوں کا پیار اور اس کی مٹی کی سوندھی خوشبو اور حیات بخش اپنائیت سے منہ موڑا تھا اور لکھاوری اینٹوں والے گھر کا مان توڑا تھا اور جب گھر سے آخری بار کبھی نہ لوٹنے کے عہد کے ساتھ نکلا تھا تو دل بوجھ سے بھاری تھا۔ سانسیں ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہی تھیں اور آنکھوں میں محبتوں کا قلزم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور میں نے دیکھا تھا کہ میرے گھر کے در و دیوار میری بے وفائی کے غم سے نڈھال تھے اور سب سے بڑا صدری دروازہ بے آسرا ہو کر قلابوں میں جھول گیا تھا اور رام دیال تیلی کی بوڑھی ماں نے کھٹیا پر پڑے پڑے آنکھوں پر ہاتھ کی چھتری بنا کے پوچھا تھا۔

"کو۔ جات ہے"

"میاں ہرے پاکستان جات ہیں"، کسی نے اُسے بتایا تھا

"کب آئی اہیں"

"اب کا اہی اہیں، کوؤ پاکستان جائیے کے پھر گاؤں کبھوں نہیں آئیا"

لڑکپن کی جذباتی عمر۔ ایسی دل شکن باتیں اور ایسا پیغمبری سفر، مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ مستقبل کیا ہے، منزل کہاں ہے۔ جب پاؤں کے چھالے رسنے لگے اور ہونٹوں کی پپڑیاں چٹخنے لگیں تو مجھے جس برگد سمان چھتنار اور عظیم پیڑ نے اپنے پناہ کے سایے میں سمیٹ لیا انھیں کچھ لوگ دلدار بھائی کے نام سے جانتے ہیں کچھ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام سے اور میں انھیں ان کے تمام ناموں سے جانتا ہوں اور ان کا ہر نام میرے سینے کے اندر دھڑکن اور سینے کے اوپر تمغے کی طرح سجا ہوا ہے۔

میں ناموں کا شمار تو نہیں کرتا مگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے سایۂ میں جس کی جیسی بساط تھی اتنی پناہ اور جتنی تپسیا تھی اُتنا گیان سب کو ملا اور کوئی خالی نہ پھرا البتہ مجھے ان کے سائے میں پناہ تو تمام و کمال ملی لیکن گیان میری استطاعت کی چھوٹی سی مٹھی بھر ہی مل سکا یہ ان کی عطا کا بخل نہ تھا میری تپسیا ہی ہمیشہ نامکمل رہی پھر بھی یہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہی کی نظر کا فیض تھا جس نے مجھے حیدر آباد دکن میں علی شبر حاتمی کے کتاب گھر سے اردو کلاسیکی اور جدید ادب پڑھنے پر مائل کیا۔ ڈھاکے میں جہاں کوئی اپنا نہ تھا مجھے ناساعد حالات کے باوجود بے راہ رو اور کراچی میں ہر طرح کی اڑچنوں اور متضاد حالات و ملازمت

کے باوصف لکھنے پڑھنے سے غافل نہ ہونے دیا اور ابتدا میں علامہ نیاز فتح پوری رسالے نگار کا ادنیٰ کارکن رہا پھر ادارے میں شریک ہوا اور اب اسی رسالے کا نائب مدیر ہوں اور ہم پوری جس طرح اپنی دوستیوں میں کھرے ہوتے ہیں اسی طرح اپنی وفاداریاں بھی نباہتے ہیں اور پیچھے ہٹنا نہیں جانتے سو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نیابت میرے لیے کل بھی باعث افتخار تھی اور آج بھی ہے کسی دانشور نے کہا تھا کہ روم میں دوسری پوزیشن پر رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی کسی چھوٹے سے گاؤں میں ہے مگر پہلی پوزیشن پر رہے لیکن دانشوروں کے فیصلے نفع نقصان کی کسوٹی پر کسے ہوتے ہیں دل کی میزان پر نہیں تلتے۔ میں رسالہ نگار میں اپنی دوسری پوزیشن اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نیابت پر ایک نہیں ایک ہزار روم قربان کر سکتا ہوں اور رسالہ نگار کے نائب مدیر کے اعزاز کا دفاع ہر لمحہ اور ہر محاذ پر کرتے رہنے کے عزم کو ڈاکٹر صاحب سے اپنی وفاداری اور اپنے اندر کی سچائی سمجھتا ہوں اور اپنے اس افتخار کے ہمیشہ قایم رہنے کے لیے ڈاکٹر فرمان کے ہزار برس زندہ رہنے اور اسی توانائی اور مسرت کے ساتھ نگار کو جاری رکھنے کے لیے رب العزت کے حضور دست بدعا رہنے کو ہی عبادت سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بارے میں ان سطروں کے لکھنے کا خیال آتے ہی شہزادہ سلار تھ مجھے بے سبب یاد نہ آئے تھے میں نے جب بھی جہاں کہیں بھی گوتم جی کی مورتی دیکھی مجھے ان کی پتھر چہرہ مورتی پر ہمیشہ انکساری اور دائمی سکون دکھائی دیا۔ جس سے مجھے ایک طرح کی مسرت اور طمانیت کا احساس ہوا اور گوتم بدھ جی کی یہ ادا ہمیشہ بہت اچھی لگی۔ میں جب بھی اپنے روز و شب کی اونچ نیچ میں کسی الجھن یا پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر فرمان کے پاس پہنچا تو انھوں نے مجھے اس عالم میں دیکھتے ہی کچھ کہنے سننے سے پہلے ہمیشہ اپنے سینے سے لگا لیا اور تشفی کے چند جملے کہہ دیے اور پھر جب میں نے ان کا چہرہ دیکھا تو گوتم جی کی مورتی جیسی شانتی مجھے ان کے چہرے پر، ممتا جیسی شفقت ان کی آنکھوں میں اور ایک غمگسار دوست جیسی رفاقت ان کے جذبات کی شدت سے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر ہمیشہ نظر آئی اور آن کی آن میں وہ تند و تیز آندھی جس کے جھکڑوں نے میرا اعتماد متزلزل اور میرا حوصلہ پست کر دیا تھا صبح کی عطر بیز ہوا کی طرح بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاید ڈاکٹر صاحب کی تمام عمر کی سادگی، نیکی اور سب کے لیے بے ریا صحبتوں نے ان کے اندر کوئی روحانی قوت پیدا کر دی ہے جس کا خود انھیں بھی علم و احساس نہیں ہے لیکن اس مخفی قوت کا فیض ان کے چاہنے والوں کے لیے ہر لمحہ جاری ہے۔

نیکی کی اس مخفی قوت کا پہلا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ فتح پور میں امتحان سے پہلے میں عزیز کاظمی، لیاقت اور دو لڑکے اور جن کے نام اب مجھے یاد نہیں کمبائنڈ اسٹڈی کرتے تھے اور ڈاکٹر فرمان جو ان دنوں ماسٹر صاحب یا دلدار بھائی تھے ہم لوگوں کو حساب الجبرا جیومیٹری اور انگریزی پڑھا کرتے تھے میں حساب میں بہت کمزور تھا وہ تو آج بھی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنا یا بجٹ بنانا نہیں آتا سو اس مشکل میں پڑتا ہی نہیں۔ امتحان ہوا سب کے سارے پرچے ٹھیک ٹھاک ہو گئے حساب الجبرا اور جیومیٹری کا آخری مشترک پرچہ تھا جو میں گوڑ آیا تھا سب نے طرح طرح کا ٹوٹلنگ کی مجھے ملنے والے نمبروں کا اندازہ لگایا اور بالآخر یہ طے پایا کہ میرا حساب کا پرچہ گر گیا ہے اور اب دوا کا نہیں دعا کا وقت ہے۔ میرا جی بھر آیا اور میں اداس ہو گیا ڈاکٹر صاحب پہلے تو ہنستے رہے جب میں رونے لگا تو انھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

"ابے تیں ضرور پاس ہوئی جیسے چاہے کوئی اُدوُ پاس ہوئے یا نہ ہوئے۔"

ڈاکٹر صاحب کی اپنی بولی اور مخصوص لہجے میں پورے یقین سے کہے ہوئے یہ الفاظ میرے دل پر رحمت

کی بارش قطروں کی طرح گرے اور میرا جی سنبھل گیا۔ دو مہینے بعد جب میں نے حیدرآباد دکن میں اپنا نتیجہ سنا تو میں امتیازی نمبروں سے پاس ہو گیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے وہ الفاظ یاد آئے اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کیوں کہ حیدرآباد دکن کا ہی وہ پہلا سفر تھا جب میں نہ صرف ڈاکٹر صاحب سے بلکہ ماں باپ سے ایک طویل عرصے کے لیے بچھڑا تھا۔ سقوطِ حیدرآباد کے بعد پھر میں گاؤں آیا تو ڈاکٹر صاحب پاکستان جا چکے تھے۔ اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ گاؤں سے پھر میں مشرقی پاکستان گیا اور وہاں کے قیام کے دوران مجھے کچھ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کہاں اور کس حال میں ہیں اور غالباً ڈاکٹر صاحب کو بھی میرے بارے میں کچھ پتا نہ تھا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

۱۹۷۸ میں ڈاکٹر صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ PERFECTION کوئی چیز نہیں اور تم اس چکر سے باہر نکلو۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں سمجھا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا اب تک تمہارے کتنے افسانے شائع ہو چکے ہیں اور کتنے غیر مطبوعہ ہیں میں نے اندازے سے تعداد بتا دی بولے بس پہلے اپنے تمام افسانوں سے کڑا انتخاب کرو اور پھر مجھے دکھاؤ اور اپنا مجموعہ لے آؤ تمہارے افسانوں کی اشاعت کا یہ موزوں ترین وقت ہے علامت کے نام پر نثریش تحریروں کا بھی انبار لگ رہا ہے ایسے میں تمہارا مجموعہ ناقدوں اور قارئین دونوں میں مقبول ہو گا۔

"بدن کا طواف" میرا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۷۸ میں شایع ہوا اور اسے آدم جی ادبی انعام ملا اور ڈاکٹر صاحب کا کہا حرف بحرف پورا ہوا۔ "نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" یہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے فیضانِ نظر کا دوسرا اہم واقعہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی درویشی اور دعاؤں کی تاثیر کا میرے ساتھ تیسرا اہم واقعہ ۱۹۸۳ء کا ہے میں کراچی میں فریر کے بوسیدہ سرکاری فلیٹ میں رہتا تھا ان فلیٹس کی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ میرے اکثر دوست سڑک پر کھڑے ہو کر مجھے آواز دیتے تھے اور جب میں دوسری منزل کی بالکونی سے اپنے ان دوستوں کو اوپر آ جانے کے لیے کہتا تو ان میں سے بعض کہا کرتے تھے کہ تم ہی نیچے آ جاؤ اگر ہم دو تین آدمی ایک ساتھ اوپر آئے تو شاید تمہارا یہ بوسیدہ فلیٹ ہمارا بوجھ نہ سنبھال سکے اور بیٹھ جائے۔ ۱۹۸۳ ہی کی ایک شام میرے اسی بوسیدہ فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں ہاکی کے مایہ ناز کھلاڑی سمیع اللہ اپنے بھائی ہدایت اللہ اور بھابی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ہم سب چائے پی رہے تھے کہ چھت سے اچانک اور بغیر کسی استعمال کے پلاسٹر کا ایک بڑا سا ٹکڑا صوفے پر آ گرا اور ہم سب خدا کے شکر گزار ہوئے کہ اگر یہی ٹکڑا خدانخواستہ مہمانوں میں سے کسی پر گرتا تو کیا ہوتا۔ اس واقعہ پر میری شرمندگی اور خفت میں آج تک کمی نہیں ہوئی۔ میں نے اسی شام فیصلہ کیا تھا کہ ہر قیمت پر یہ فلیٹ چھوڑ دوں گا گلشن میں اب میں جس گھر میں رہتا ہوں میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ جسے ایک مکان خریدنے کی شدید ضرورت تھی اس کے لیے دیکھا تھا۔ مکان کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ میرے دوست نے ہر طرح پسند آنے کے باوجود اسے خریدنے کا خیال ترک کر دیا تھا مگر مجھے یہ مکان اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے بڑے دکھ سے کہا کہ کیا میں بھی کبھی ایسے مکان میں رہ سکوں گا۔ قیمت لاکھوں میں تھی پیسے میرے پاس ہزاروں میں بھی نہ تھے لیکن میرے اسی دوست نے میرے وسائل کا بڑھا چڑھا کر اندازہ لگایا اور فیصلہ صادر کر دیا کہ اگر میں جی جان سے کوشش کروں تو شاید یہ گھر خرید سکوں (میرے دوست کا اپنے اس فیصلے کی بنیاد پر اب یہ دعوا ہے کہ یہ گھر دراصل اس نے مجھے دلایا ہے اور میں اس کے اس دعوے کا احترام کرتا ہوں) میں نے مکان کی خرید کے سلسلے میں بھی حسبِ معمول ڈاکٹر صاحب سے بات کی ڈاکٹر صاحب نے میری حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اپنے عزیز دوستوں اور عزیزوں کی ایک فہرست بناؤ اور سب سے جو کچھ ہو سکے قرض لو انشاءاللہ تم یہ گھر ضرور خرید لو گے۔ ہم لوگ قرض ادھار کے ذریعے ہی مکان بنا سکتے ہیں یکمشت اتنی رقم شاید کبھی ہمارے پاس نہ ہو سکے گی اس میں شرمانے یا تکلف کرنے کی ضرورت

نہیں ہے ۲۰ مارچ کو، جو میری تاریخ پیدائش بھی ہے میں نے اپنا گھر خرید لیا۔ اور دو ہفتوں تک سوئی گیس دہل سکی اور دو ہفتے تک میں نے اپنے چھوٹے بھائی صغیر اور ڈاکٹر صاحب کی میزبانی کا خوب لطف اٹھایا۔ یوں میرے خواب کی تعبیر اور ڈاکٹر صاحب کے کہے ہوے جملوں کی تاثیر مکمل ہوئی۔

میری نیاز مندی کی ابتدا ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے نہیں دلدار بھائی سے فتح پور میں ہوئی تھی میں نے حلیم کالج کانپور سے بوجوہ ٹرانسفر سرٹیفیکیٹ لے کر مسلم اسکول فتح پور میں داخلہ لیا تھا جہاں میرے ماموں کامل صاحب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شباہت صاحب اور شہاب الدین انجم صاحب ٹیچر تھے۔ شہاب الدین صاحب شعر کہتے تھے اور انجم تخلص تھا۔ یہ سب لوگ اپنی تعلیم کی تکمیل کی وجہ سے یا بہتر مستقبل کے انتظار میں یہاں ملازمت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی سال میٹرک کیا تھا اور مسلم اسکول میں میٹرک کے طلبہ کو انگریزی پڑھا رہے تھے ماسٹر انجم صاحب اپنی شاعری اور مزاج کی وجہ سے ان سب کی دلچسپی کا مرکز تھے اور عموماً ماسٹر انجم صاحب ہی تختہ مشق رہا کرتے تھے۔

مسلم اسکول میں میرا ششماہی امتحان تھا امتحان کے کمرے میں میری نشست بیچ کی قطار میں سب سے آگے تھی اور میری میز اس بڑی میز سے ملی ہوئی تھی جو انو جی لیٹرز تھے اور میز کے ایک سرے پر یہ اور دوسرے سرے پر وہ بیٹھے ہوئے تھے ان دنوں ابھی بال پن کا استعمال شروع نہ ہوا تھا اور فاؤنٹین پین اور ہولڈرز عموماً استعمال ہوتے تھے اور روشنائی کے لیے شیشے کی چوکور دوات ہوتی جس پر ٹین کا چاندی کے روپئے کے برابر ڈھکنا ہوا کرتا تھا ایسا ہی ایک چمکدار ڈھکنا ڈاکٹر فرمان صاحب کے قریب ہی میز پڑا ہوا تھا۔ ماسٹر شہاب الدین انجم صاحب نے ڈاکٹر فرمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دلدار دیکھو وہ روپیہ پڑا ہوا ہے اٹھا لو اور انھوں نے دوات کے اسی ڈھکنے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ماسٹر انجم صاحب کی آواز پر پہلے ان کی طرف پھر اس چمکدار ڈھکنے کی طرف دیکھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ابھی میں نے گردن جھکائی ہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب بولے۔

" اُمراؤ" میں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا تو بولے۔

" نظر آتا ہے روپیہ ان کو ڈھکن روشنائی کا "

بہت کمزور رہے ہے چشم انجم ہوئی جاتی ہے

ڈاکٹر صاحب نے ذرا سے وقفے میں برجستہ شعر کہا اور امتحان کا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور ماسٹر شہاب الدین انجم صاحب خجل ہو کر ہنسنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کو فی البدیہہ شعر کہنے میں ایسا ملکہ ہے کہ شاید بہت سے پر گو شعرا بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں لیکن اس خوبی کا اظہار کبھی کبھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں اور ڈاکٹر صاحب گاڈس کے دفتر سے بسلہ ہوتے ہوئے ناظم آباد جا رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب اپنی پریفیکٹ گاڑی خود ڈرائو کر رہے تھے کہ شعر و شاعری کا ذکر چھڑ گیا اور ڈاکٹر صاحب نے بسیط سے غالب لائبریری تک اشعار کی بھرمار کر دی میں مصرعہ دیتا وہ شعر کہہ دیتے یا گرہ لگا دیتے میں موضوع دیتا وہ گاڑی کا گیر بدلتے اور خیال کی رو تیز ہو جاتی اور اشعار کا نزول شروع ہو جاتا اس دن اس مختصر سے فاصلے اور رو قفے کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے کوئی دس بارہ اشعار ضرور کہے ہوں گے اور لطف یہ کہ کوئی شعر فضول یا بے جان نہ تھا اب سوچتا ہوں کہ اگر وہ اشعار کسی طرح محفوظ کر سکتا تو صحیح اندازہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کے اندر کتنا خوب صورت اور پر گو شاعر چھپا ہوا ہے مزید یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ایک خوب صورت شاعر ہی نہیں ایک بہت کامیاب CONVERSATIONIST بھی ہمیشہ سے موجود ہے جسے ڈاکٹر کے علم اور پیشے نے درجہ کمال کو پہنچا دیا ہے وہ کبھی کبھی جب بالکل تنہا ہوتے ہیں یا میرے

علم میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں یا کسی واقعہ سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کا لہجہ اپنے آپ سے گفتگو کرنے والا ہوتا ہے تو وہ کہیں اور سنا کرے کوئی "کا سماں بندھ جاتا ہے وہ شخصیتوں اور موضوعات پر ایسی مدلل مسحور کن، پر مغز اور فیصلہ کن گفتگو کرتے ہیں کہ شخصیت یا موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ پاتا۔ ایسی ہی کیفیت میں وہ غالب، اقبال، حسرت موہانی، نظیر اکبرآبادی، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر محمود حسین کے علاوہ اپنے پسندیدہ دوستوں شاعروں اور ادیبوں میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ادا جعفری، خلیق انجم، گوپی چند نارنگ وغیرہ کا ذکر بڑی محبت و احترام سے کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب جن لوگوں سے محبت کرتے ہیں ان کا ذکر بھی بہت زیادہ بلکہ موقع بے موقع کرتے رہے ہیں اور ان کے کام اور ان کی شخصیت پر اتنی بھرپور گفتگو ایسے فیصلہ کن انداز میں کرتے ہیں کہ ان کے فن اور شخصیت کے بہت سے نامعلوم گوشے سامنے آجاتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان شخصیتوں سے تو ہم اب پہلی بار مل رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے ہیں کہ فن کار کے فن میں اس کی پوری شخصیت موجود ہوتی ہے اور نقاد فن سے فن کار تک رسائی حاصل کرتا ہے چھوٹا آدمی کبھی بڑا فن پیدا نہیں کر سکتا اور وہ اسی اصول پر کسی بھی فن کار اور اس کے فن کا تجزیہ کرتے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ قدیم و جدید تمام ہی ادیبوں اور شاعروں کی کمزوریوں اور خوبیوں اور ان کے کلام کے حسن و قبح پر ان کی نظر ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی وہ ان کے کلام میں کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پبلیسیٹی اور پی آر کی بنیاد پر اونچی قامت میں نظر آنے والے شاعر و افسانہ نگار زیادہ دیر ان بیساکھیوں کے سہارے کھڑے نہیں رہ سکتے بالآخر یہ اپنی اصل قامت پر لوٹ آئیں گے کون بڑا ادیب ہے کون چھوٹا کون اچھا ہے کون برا یہ فن کار کا مسئلہ نہیں ہے یہ فیصلہ صرف وقت کرتا ہے ادیبوں اور ناقدوں کو صرف اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔ کاش ڈاکٹر صاحب کے ایسے تمام مباحث، ایسی تمام گفتگو اور ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ایسے تمام بے لاگ فیصلے ان کی آواز میں محفوظ کر سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کی پرفیکٹ گاڑی ان کی پہلی کار تھی اور اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب اور رسالہ نگار کی مجلس ادارت پر یہ کار بالکل اسی طرح سجتی تھی جیسے ان دنوں فوکسی اور سرشار صدیقی آپس میں خوب گھلے ملے رہتے ہیں اور لازم و ملزوم نظر آنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پرفیکٹ گاڑی کا گیر اس بے رحمی سے بدلتے تھے جیسے برمے سے گاڑی کے فرش میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں اور اسٹیرنگ اس طرح گھماتے تھے جیسے فیل بان آنکس سے ہاتھی کا منہ پھیرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پرفیکٹ گاڑی تک تو میں گاڑی کے سیکنڈ ہینڈ ہونے کا نقص سمجھتا رہا لیکن اب جب میں نے نئی گاڑیوں پر بھی ڈاکٹر صاحب کی گرفت اسی طرح مضبوط دیکھی تو مجھے سوزوکی ایف ایکس کی نازک مزاجی پر رحم آگیا اور آنکس سے ہاتھی کی ڈرائیونگ آسان محسوس ہوئی۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہم نگار کا ڈاکٹر محمود حسین نمبر نکال رہے تھے اور صبح سے شام تک بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ ہم دن دن بھر ایک دفتر سے دوسرے دفتر اور ایک صاحب سے دوسرے صاحب کی تلاش میں دفتروں اور کوٹھیوں کے چکر پر چکر لگا رہے تھے کبھی دفتر نہ ملتا تو کبھی صاحب نہ ملتے۔ انھیں دنوں پریس انفارمیشن والوں کو نگار کی آمدنی و خرچ کا خیالِ خام بھی آگیا اور وہ چیل کے گھونسلے میں ماس تلاش کرنے لگے ادھر ہمارے کاتب صاحب کہ دھان پان تو پہلے تھے اوپر سے بیمار ہونے کی کاتبوں والی کہنہ مشقی شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت ہے کہ نمبر خاص نمبر نکالنے کی تاریخ مقرر کر کے اسی تاریخ پر خاص نمبر نکالنے کی ضد کر لیتے ہیں گاڑی چلا چلا کے ڈاکٹر صاحب کے بازو میں درد رہنے لگا۔ مگر ہمارا سفر بہر حال جاری تھا۔ ایک دن گھومتے گھومتے اور کھوجتے کھوجتے

صدر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بوہری بازار کے قریب کار روک دی ہم دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور ڈاکٹر صاحب فٹ پاتھ پر رک گئے سامنے ہی گرم گرم جلیبیاں تلی جارہی تھی ڈاکٹر صاحب نے جلیبیاں خریدیں اور ہم دونوں قریب کے ہوٹل میں جاکر بیٹھ گئے۔

"امراؤ۔ بھئی اس کی جلیبی کا جواب نہیں۔ جب بھی جلیبی کھانا ہو اسی سے جلیبی خریدنا"

ہم لوگوں نے جی بھر کے جلیبی کھائی ڈاکٹر صاحب جب تک جلیبیاں کھاتے رہے جلیبیوں کے فوائد اور اس کے شیرے کے فوائد الگ الگ بیان کرتے رہے اور ہندو حلوائی کی بنائی ہوئی جلیبیوں اور مسلمان حلوائی کی بنائی ہوئی جلیبیوں کا فرق بتلاتے رہے۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اسی طرح گولی مار پر گاڑی کھڑی کردی اور ایک دوکان میں گھس گئے بیٹھنے کی معقول جگہ تھی بیٹھتے ہی جلیبیوں کا آرڈر دے دیا اور میری طرف دیکھ کر مجھے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت ہے کہ جب بھی کسی بات پر زور دینا ہوتا ہے تو پہلے امراؤ کہہ کر مخاطب کرنا کبھی نہیں بھولتے

امراؤ۔ جب بھی جلیبی کھانے کا خیال آئے اس کی جلیبی بہت عمدہ ہوتی ہے"

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ نے تو بوہری بازار کی جلیبیوں کی تعریف کی تھی،،

"ظاہر ہے" ڈاکٹر صاحب بولے "گولی مار میں بوہری بازار کی جلیبیاں کیسے ملیں گی اور پھر جلیبیاں تو عموماً اچھی ہی ہوتی ہیں سب سے اہم بات بیٹھنے کی عمدہ جگہ ہونی چاہیے۔ جلیبی تو آرام سے بیٹھ کر کھانے کی چیز ہے

ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے پھر پروگرام دیکھ کر بولے آج دوپہر کا کھانا ایر کنڈیشنڈ ہوٹل میں کھائیں گے۔ نگار کے مدیر اور نائب مدیر کو کھانا ایر کنڈیشنڈ ہوٹل میں اور بھاگ دوڑ نئی کار میں کرنا چاہیے اس سے کم ہرگز نہیں۔

اس دن ہم نے دوپہر کا کھانا ایر کنڈیشنڈ ہوٹل میں کھایا۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی کھاتے رہے اور اصرار کرکے مجھے بھی کھلاتے رہے اور خوش ہوتے رہے ڈاکٹر صاحب جلیبی سے لے کر فصل میں آموں تک بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور بڑی فراخ دلی سے تواضع کرتے ہیں۔ آموں کے موسم میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں دوپہر کا کھانا ہو، تیسرے پہر کی چائے ہو یا رات کا کھانا اچھا اور بہت سا آم ضرور ہوگا۔ میں نے اچھا کہا ہے میٹھا اس لیے نہیں کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اب آم کا صرف میٹھا ہونا کافی نہیں ہے اب آم کی خوبیوں میں اس کی خوشبو، رس ہلکا گودا مناسب میٹھا، چھلکا وضعدار اور آم کی شکل طرح دار ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب آم کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں جیسے مغربی ممالک میں ملکہ حسن کے انتخاب کے لیے جج صرف چہرے کی خوب صورتی پر اکتفا نہیں کرتے۔ مجھے اس وقت لارنس روڈ پر گارڈن کے قریب نگار کا وہ دفتر خاص طور سے یاد آرہا ہے جس میں دو کرسیاں ایک چھوٹی سی میز کے علاوہ کوئی اور فرنیچر نہ تھا اس دفتر میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شام میں دو تین گھنٹے بیٹھ کر کام کرتا تھا ڈاکٹر صاحب شام پانچ بجے دفتر پہنچ جاتے تھے اس لیے میں ساڑھے چار بجے دفتر پہنچ کر پہلے دفتر میں جھاڑو دیتا پھر میز اور کرسیوں پر کپڑا مارتا اور کام شروع کر دیتا۔ ایک دن کمرے میں داخل ہونے سے قبل ڈاکٹر صاحب نے دروازے پر اک تو کمرے کا نمبر پڑھا ہندسوں کا ٹوٹل کیا اور کرسی پر بیٹھتے ہی بولے۔ امراؤ یہ دفتر فوراً چھوڑ دو کہیں اور بیٹھنے کا انتظام کرو"

میں نے پوچھا "کیوں۔ کیا ہوگیا"

بولے "اس لیے کہ اس کمرے کے نمبر کے ہندسوں کا ٹوٹل پانچ ہے جب کہ میرے اور تمہارے ناموں کے ہندسوں کا ٹوٹل ابجد کے حساب سے نو ہے۔ یہ کمرہ ہم دونوں ہی کو راس نہ آئے گا۔ اسی دن مجھے پہلی بار علم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اور میرے ناموں کا ٹوٹل نو ہے۔

میں نے ایک ہفتے کے اندر گارڈن کا وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں نگار کا دفتر تھا چھوڑ دیا۔ حالاں کہ جب یہ دفتر نہ تھا ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ کہیں بھی اور کیسا بھی ایک چھوٹا سا دفتر نگار کے لیے بنا لو خواہ وہ لکڑی کا ایک کیبن ہی کیوں نہ ہو لیکن اب ایک باقاعدہ دفتر اسی عمارت میں بڑی مشکل سے حاصل ہوا تھا جس میں بہت پہلے کبھی نگار کا دفتر رہ چکا تھا اور صرف کمروں کے نمبروں کا فرق تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اچھا بھلا کمرہ محض اس لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ ہم دونوں کے ناموں کے ہندسے نو تھے اور کمرے کی بدنصیبی کہ اس کا نمبر پانچ تھا۔ اس کمرے سے منتقل ہو کر ہم ایک ایسے کمرے میں گئے جو ایک بڑے موٹر گیراج سے ملحق تھا اور اس کا راستہ گیراج ہی سے تھا اور جہاں دن بھر کاروں کی مرمت ہوتی تھی اور کاروں کے ڈینٹ نکالنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ رواں کیے جانے والے انجنوں کی آواز مسلسل آتی رہتی تھی ڈیزل کی بو اور دھواں اس کے علاوہ تھا مگر ڈاکٹر صاحب کو وہ جگہ پسند آگئی تھی۔ ایک تو اس دفتر میں ہندسوں کے ٹوٹل کا کوئی مسئلہ نہ تھا دوسرے یہاں فرنیچر اور گنجائش زیادہ تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی پریفیکٹ کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح ہو جاتی اور سچ بات تو یہ ہے کہ پورا گیراج اور اس کے تمام کارکن ڈاکٹر صاحب کے ڈسپوزل پر ہوتے تھے کیوں کہ مالک حاجی صاحب ڈاکٹر صاحب کے معتقد ہو گئے تھے اور اگر ہم نگار کا دفتر وہاں سے منتقل نہ کر لیتے تو شاید مرید بھی ہو جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کی کار کی علالت حاجی صاحب کی ذمہ داری تھی اور حاجی صاحب کی تمام بیماریوں کا علاج اور قضیوں کا تصفیہ، ڈاکٹر صاحب مفت اور چٹکی بجاتے کر دیا کرتے تھے اور حاجی صاحب کو غذا میں جلیبیاں تجویز کرنا کبھی نہ بھولتے تھے وہ جتنی کثرت سے جلیبیاں کھاتے اور کھلاتے تھے اسی تناسب سے ڈاکٹر صاحب کی پریفیکٹ کی مرمت کا بل بڑھا دیا کرتے تھے اگر یہ سلسلہ تھوڑا سا اور دراز ہو جاتا تو ڈاکٹر صاحب کی پریفیکٹ جلیبیوں کے کام آجاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب نگار کا ایر کنڈیشنڈ دفتر ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہے دفتر کی صفائی رسالے کی پیکنگ ڈاک سے ترسیل اور خط و کتابت کے لیے ملازم ہیں اور خاص نمبروں کی بھاگم بھاگ کے لیے یا سالانہ یادگاری خطبوں کے اہتمام کے لیے ایک سے زیادہ نئی اور آرام دہ کاریں ہیں اب تو بہت دنوں سے میں نے نگار کے دفتر کی صفائی کی ہے نہ میز اور کرسیوں پر کپڑا مار کر گرد صاف کی ہے اور نہ ڈاک سے ارسال کے لیے نگار کے پیکٹ بنائے ہیں اور اب یوں لگتا ہے جیسے میں نگار سے اور نگار مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان کے اندر یورپ کے گاؤں کا وہ دیہاتی پوربی آج بھی زندہ ہے جو اپنی سادگی، اعتماد اور وفاداری پر فخر کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں ہے اس لیے کہ وہ انھیں اوصاف کی پاسداری کو زندگی کرنا سمجھتا ہے۔ کراچی کی گہما گہمی روشنیاں اور یونیورسٹی کی اعلا ترین ڈگریاں بھی ڈاکٹر فرمان کے اندر کے اس دیہاتی کو رام نہ کر سکیں اور وہ ہیبت پور سے لے کر ایوانِ صدر اسلام آباد تک اسی طرح کھرا، کھرا اور بے باک رہا جس طرح وہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں اور مہوے کے درخت کے سائے میں پروائی چلنے والے کنویں کی ڈھلوان پر رہا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی ان کا کوئی چہیتا دشمنوں میں گھر کر ان کو مدد کے لیے آواز دے تو وہ ہاتھ میں لاٹھی لے کر ننگے پاؤں سڑک پر نکل آئیں گے اور ایک لمحے کو بھی توقف نہ کریں گے۔ وہ کسی کو کسی بُرے حال میں تنہا چھوڑ دینے کا تصور تک نہیں کر سکتے ان سے

جو بھی ملا جب بھی ملا وہ اس کے ہو رہے اور پھر ہمیشہ اس سے باخبر رہنے اور اس کے کسی کام آنے کی سبیل کرتے رہے خواہ اس کو اس کا علم ہو یا نہ ہو کبھی کبھی تو ان کے جذبات کی شدت سب کو پریشان کر دیتی ہے وہ جس طرح اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے اسی طرح میری بیٹیوں کی رخصتی پر جی بھر کے روئے اور رلاتے رہے۔ ارض مقدس پر ان کی طویل دعاؤں میں خاندان اور اعزا کی بیٹیوں کے نام بھی ان کی بیٹیوں کے ناموں کے ساتھ شامل تھے اور ان کی دعائیں اور ان کے آنسو آپس میں اس طرح خلط ملط ہوئے کہ کوئی دعا اشکوں سے دھلے بغیر ہونٹوں تک نہ آسکی۔

علامہ نیاز فتح پوری سے ڈاکٹر صاحب کی نیاز مندی اب ساری ادبی دنیا کے علم میں ہے ۱۹۲۲ میں جاری ہونے والا نگار علامہ نیاز کے بعد بھی آج تک جاری ہے اور اس کا کوئی شمارہ بے توجہی کی زد میں نہیں آیا نہ صرف یہ بلکہ ڈاکٹر فرمان نے علامہ نیاز فتح پوری اور نگار کے نام کو ایک لمحے کے لیے بھی ادبی افق پر ماند نہیں پڑنے دیا اور ہر سال پاک و بھارت کے ادیب اظہارِ خیال کے لیے کراچی میں جمع ہونے لگے۔ حتیٰ کے علامہ نیاز یادگاری خطبے کے اہتمام کے بعد سے اکابرین ادب یونیورسٹی میں علامہ نیاز اور نگار کے حوالے سے اجتماعات کا اہتمام ممکن ہو گیا ہے۔ اردو کے کسی دوسرے ادیب کے نام کو ادارے بھی اس طرح زندہ نہ رکھ سکے جس طرح ہر ماہ نگار کی پابندی سے اشاعت کے علاوہ ہر سال یادگاری خطبے کے عنوان سے علامہ نیاز فتح پوری کے نام اور کام کو ڈاکٹر فرمان منظرِ عام پر لاتے رہے ہیں اور یہ کام ڈاکٹر فرمان تنِ تنہا کرتے رہے ہیں۔ وہ خود ہی پروگرام ترتیب دیتے ہیں، یادگاری خطبے کے عنوانات منتخب کرتے ہیں بھارت اور پاکستان کے دوسرے شہروں اور کراچی سے کن زعما کو لکچر کی زحمت دینی ہے اس کا فیصلہ کرتے ہیں فنڈز کا اہتمام کرتے ہیں، دعوت نامے چھپواتے ہیں اور وینیو اور مینو تک خود ہی طے کر دیتے ہیں عملاً ہمارے کرنے کے لیے جب کچھ نہیں رہ جاتا تو ہم صرف لفافوں پر پتے لکھ کر جلسے میں شرکت کرتے ہیں یا ڈاکٹر صاحب کے ایک آدھ فوری حکم کی تعمیل کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں۔ ہمارے کرنے کے لیے ہوتا ہی کچھ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کا اعتماد سب کو زیرو کیے رکھتا ہے۔ نیاز و نگار کا ہر مرحلہ ان کی وفاداری، سادگی اور اعتماد کا بہترین نمونہ ہے۔ در اصل ڈاکٹر فرمان مدبر نہیں ادارہ ہیں، ذات نہیں انجمن ہیں اور خواہش نہیں دعا ہیں جس پر قبولیت کے تمام در وا ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے علم و فضل، ان کے ادبی مرتبے اور خدمات کا اعتراف تو ان جیسے اہلِ علم اکثر کرتے رہتے ہیں اور کرتے بھی رہیں گے حکومت بھی اعزازات سے نواز چکی ہے ڈاکٹر صاحب کے اس طویل سفر کو اگر مڑ کر دیکھوں تو ضلع فتح پور کے ایک گاؤں سے ایوان صدر اسلام آباد تک کا سفر بڑی کٹھنا ئیوں انتھک محنت اور بے مثل جرات کا طویل سفر ہے اور اس طویل سفر میں نہ ڈاکٹر صاحب کی کسی نے رہنمائی کی ہے اور نہ سہارا دیا ہے یہ ان کی خود اعتمادی اور خودسری کا سفر ہے یہ عزم اور سرکشیدگی کا سفر ہے اور یہ جہد مسلسل اور عزتِ نفس کے تحفظ کا سفر ہے۔ ڈاکٹر صاحب انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں ان میں خامیاں بھی ضرور ہوں گی جن کا علم ان کے قریبی اور بے تکلف دوستوں کو ضرور ہوگا میں تو ڈاکٹر صاحب کو ساری زندگی اسی قدر دیکھ پایا ہوں جتنا ایک بھکشو پوجا کے دوران گوتم جی کو دیکھ کر اپنے تئیں ایمان و گیان کے دیے روشن کر لیتا ہے اور چپ چاپ ہاتھوں میں لیے ہوئے پھول قدموں میں ڈال دیتا ہے میرے ہاتھوں میں یہی کچھ بے رنگ و بو پھول تھے جو ان کے قدموں میں رکھ چلا ہوں۔ ڈاکٹر محمود حسین نمبر کی تیاری کے دنوں میں ایک دن ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا تھا۔ "امراؤ۔ بڑا آدمی وہ ہے جو چھوٹوں کو بڑا بنا دے۔ ڈاکٹر محمود حسین ایسے ہی بڑے آدمی تھے۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ بات جس قدر اعتماد سے ڈاکٹر محمود حسین کے بارے میں کہی تھی یہی بات میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے بارے میں اسی اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں اور اس پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔

نورین فردوس

ڈاکٹر فرمان فتحپوری بحیثیت محقق

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمارے ملک کے نامور محقق اور نقاد ہیں۔ ان کی تحقیقی اور تنقیدی کتب علمی و ادبی دنیا کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ فرمان صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ معلم زبان و ادب، محقق و نقاد، مدیر جریدہ، نگار و اردو لغت اور بلند پایہ منتظم۔ یوں دیکھا جائے تو فرمان صاحب ایک جامع الحیثیات شخصیت ہیں اور ہر حیثیت میں کامیاب و کامران استاد ہیں ایسے استاد کہ اپنے بیان کی شیرینی و اثر آفرینی اور موضوعات درس پر کامل دسترس رکھنے کے باعث استادوں کے لیے باعث رشک ہیں۔ محقق و نقاد ہیں تو ایسے کہ ان کی کتب تحقیق و تنقید سند کا درجہ رکھتی ہیں، منتظم و مدیر ہیں تو ایسے کہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا ہر شخص لوہا مانتا ہے اور نگار کے مدیر کی حیثیت میں انھوں نے دنیائے ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ موضوع علمی ہو یا ادبی، نثری ہو کہ شعری ان کا اشہب قلم ہر میدان میں خوب صورتی و خوش قدمی سے رواں نظر آتا ہے۔ ان کی کتاب زندگی کو کھول کر دیکھا جائے تو ہر منزل اور موڑ پر وہ ہمیں پیہم رواں ہر دم جواں نظر آتے ہیں۔ فرمان صاحب کی فکری جولاں گاہ بڑی وسیع ہے۔ کبھی وہ اردو زبان کی اصلاح کے لیے شاندار تجاویز کے ساتھ کمربستہ نظر آتے ہیں کبھی کسی وسیع اور دقیق تحقیقی موضوع کے لیے مواد کی تلاش و ترتیب میں منہمک، کبھی اردو زبان و ادب کی تدریس کے اصول و مسائل پر بحث کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی کسی ادبی شہ پارے کی جانچ پرکھ میں مصروف سچ ہے بڑے لوگوں کی زندگی ایسے ہی کارناموں سے پر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے سچ کہا ہے کہ "اردو زبان و ادب اور مجلاتی صحافت کے حوالے سے عالمی شہرت کے دانشور ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری متعدد اعلا پائے کی تحقیقی و تنقیدی کتابوں اور مقالوں کے مصنف و مرتب ہیں جن کا مطالعہ ملک اور بیرون ملک کی ان ساری یونیورسٹیوں میں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے جوائے لازم کی حیثیت رکھتا ہے"، لیکن اس جگہ مجھے فرمان صاحب کے صرف تحقیقی کاموں کا جائزہ لے کر ان کی محققانہ حیثیت کا تعین کرتا ہے۔

تحقیق کا مقصد حقایق کی دریافت ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے صحیح اور غلط کے مابین امتیاز کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسے طرز مطالعہ کا کام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تحقیق کے لیے شوق اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ سخت محنت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تحقیق کے لیے مواد گرداوری میں نہ صرف کتابوں، مخطوطوں وغیرہ کے اوراق الٹنے ہوتے ہیں بلکہ ہر قسم کی راحت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق میں صبر آزما محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمارے ملک کے ایسے محقق ہیں جو اس صبر آزما محنت کے عادی ہیں۔ ادبی تحقیق کے میدان میں ان کے شوق اور دل چسپی کی وجہ سے ان کا شمار آج اردو اب کے نامور محققین میں ہوتا ہے۔

اردو کی ادبی تحقیق کی روایت میں سر سید احمد خان اور ان کے رفقا کی تحقیقی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اردو کے پہلے باقاعدہ محقق ہونے کا اعزاز حافظ محمود شیرانی کو حاصل ہے۔ حافظ صاحب کی

بے مثال تحقیقی خدمات کے وجہ سے ان کا شمار صف اول کے محققین میں ہوتا ہے دیگر محققین میں مولوی عبدالحق، مولانا عرشی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر وحید قریشی، قاضی عبدالودود، سید مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان ڈاکٹر غلام محی الدین قادری اور مالک رام وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ محققین کے اس قافلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا نام پاکستان بننے کے بعد شامل ہوا لیکن ان کی تحقیقی لگن کی وجہ سے جلد ہی ان کا شمار صف اول کے محققین میں ہونے لگا۔ ڈاکٹر سلیم اختر، فرمان صاحب کا نام دوسرے محققین کے ساتھ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جن اصحاب نے تحقیق میں خصوصی نام پیدا کیا اور اپنی محنت اور کاوش سے اردو تحقیق کے دائرہ کو وسیع کیا۔ ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مشفق خواجہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی ایسے قابل ذکر اسماء نظر آتے ہیں۔ ان حضرات کی گرانقدر تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اصناف ادب اور اہل قلم کے بارے میں کارآمد معلومات جمع کر کے تاریخ ادب کو کئی لحاظ سے وسعت دی۔[1]

فرمان صاحب کی تحقیق کے موضوعات کو دیکھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ فرمان صاحب نے کسی خاص موضوع کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب نہیں کیا بلکہ ادب کے مختلف موضوعات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، "اردو رباعی" اور "اردو کی منظوم داستانیں" ان کے اہم تحقیقی کام ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر فرمان صاحب کی تحقیقی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تحقیقی کارناموں میں "اردو کی منظوم داستانیں" اور "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" کو بلاشبہ اہم سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فراہمی مواد میں خصوصی کاوش سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے ان کی تالیفات قابل اعتماد ثابت ہوتی ہیں۔ "زبان اور اردو زبان"، "تحقیق و تنقید" اور "اردو رباعی۔ فنی و تاریخی ارتقا" دیگر اہم تصانیف ہیں۔[2]

فرمان صاحب کی پہلی کتاب "تدریس اردو" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شایع ہوئی بنیادی طور پر یہ کتاب ثانوی اور ابتدائی مدارس کے زیر تربیت اساتذہ کے لیے ہے۔ فرمان صاحب نے اس کتاب تحقیق سے کام لیتے ہوئے اردو زبان کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کے آغاز میں پہلے یہ بتایا ہے کہ زبان کے دنیا میں وجود میں آنے کے اسباب کیا تھے اور زبان کی ابتدا کیسے ہوئی پھر اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں تفصیل دی ہے۔ فرمان صاحب نے اردو اور آریائی زبانوں کے مشترک عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اردو کی پیدائش کے سلسلے میں مختلف محققین کی آرا نقل کرنے کے بعد اپنی تحقیق کے نتائج بھی بیان کیے ان باتوں کے علاوہ فرمان صاحب نے اس کتاب میں اردو رسم الخط پر بھی بڑی خوب صورت بحث کی ہے اور اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ فرمان صاحب کی تحقیق کا یہ خاصیت ہے کہ جب وہ کسی موضوع کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کرتے ہیں تو اس کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں اور اس موضوع کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تدریس اردو میں اردو زبان کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد فرمان صاحب نے اس کی ترقی کے بارے میں چند تجاویز

---

[1] اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۸۳

[2] اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر ص ۲۸۳

پیش کی ہیں اور اس کی تدریس کے لیے چند اصول متعین کی ہیں۔

فرمان صاحب کی دوسری تحقیقی کتاب "اردو رباعی! فنی وتاریخی ارتقاء" ہے۔ رباعی ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم لکھا گیا تھا فرمان صاحب کو اس بات کا احساس تھا چنانچہ ایم۔ اے اردو کرنے سے پہلے ہی اردو رباعی پر ان کے تحقیقی مضامین چھپنے لگے تھے اور ان کی شہرت بھی خوب ہوئی۔ یہاں تک کہ ایم۔ اے اردو کی کلاسوں میں اساتذہ ان کے مضامین کے حوالے دیتے تھے۔ ایم۔ اے اردو کے لیے انھوں نے رباعی پر ہی تحقیقی مقالہ لکھا۔ اردو رباعی کے موضوع پر ان کی مستند اور جامع تصنیف "اردو رباعی! فنی وتاریخی ارتقاء ۱۹۶۲ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب میں اردو رباعی کے تقریباً تمام موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں۔

"رباعی پر مستقل اور مبسوط کام ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کیا ہے۔ ان کی تصنیف "اردو رباعی! فنی وتاریخی ارتقاء کراچی ۱۹۶۲ء) یہاں اس موضوع پر واحد اور محققانہ وناقدانہ مقالہ ہے۔ اس میں عہد قدیم سے عہد جدید تک اس صنف سخن کی ارتقائی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔"[۱]

فرمان صاحب کی یہ کتاب رباعی کے موضوع پر ایک مستند تحقیقی کام ہے۔ جس میں انھوں نے رباعی کی صنف کے تمام پہلوؤں کو حقایق کی روشنی میں دیکھا ہے اور اس کے آغاز وارتقاء اور فنی لوازم کے بارے میں مستند معلومات فراہم کی ہیں اور عہد بہ عہد رباعی کی صنف کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب سے پہلے ہمیں اس موضوع پر کوئی اور مستند کتاب نہیں ملتی۔ یہ کتاب درحقیقت فرمان صاحب کی محققانہ کوششوں کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ فرمان صاحب کی اس کتاب کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں۔

"فرمان فتح پوری یوں تو ادب کے قریب قریب تمام اصناف پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں لیکن صنف رباعی جو میرے نزدیک سب سے زیادہ مشکل صنف ہے اس کا مطالعہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ بڑے شوق اور محنت سے کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صنف رباعی کا کوئی تاریخی یا فنی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر انھوں نے کامل غور نہ کیا ہو یا اس کی پوری تحقیق نہ کی ہو اور اس غور و تحقیق کا نتیجہ یہ کتاب ہے جسے میں ہر لحاظ سے قدر اول کی تصنیف خیال کرتا ہوں۔"[۲]

"تحقیق وتنقید" فرمان صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختلف رسائل میں شایع ہو چکے تھے۔ جنھیں فرمان صاحب نے ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ ان مضامین میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق بھی ملتی ہے۔ خاص طور پر "زبان اور رسم الخط" "جگر لخت لخت" "فارسی کی پہلی شاعرہ رابعہ" "ترانۂ شوق۔ تحقیق وتنقید کی روشنی میں" "داغ کی حیات معاشقہ" اور "قدیم اردو ڈرامہ کے ایک اہم فن کار" تحقیقی نوعیت کے مضامین ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے فرمان صاحب نے شعر وادب کے گم گشتہ گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔

"تاویل وتعبیر" بھی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں شایع ہوا۔ اس کتاب میں بھی فرمان صاحب کے تحقیقی مضامین شامل ہیں مثلاً "کلاسیکی ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ" "نظیر اکبرآبادی اور ان کے ناقدین" اور

---

[۱] اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش ص ۳۷۲، ۳۷۳ جلد دوم

[۲] تخلیص "اردو رباعی! فنی وتاریخی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔

اُردو غزل کا معمارِ اوّل ولی" وغیرہ۔ ان مضامین میں ولی والا مضمون خاص طور پر اہم ہے۔ اس مضمون میں فرمان صاحب نے ولی کے اصل نام اور اس کے وطن کے بارے میں جو تحقیقی کام کیا ہے اس سے ولی کے بارے میں پیدا شدہ غلطیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔

"غالب شاعرِ امروز و فردا" میں غالب کے کلام اور زندگی کے بارے میں مختلف مضامین ہیں۔ ان مضامین میں بعض خالص تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ "غالب کے حالات میں پہلا مضمون" "غالب کے اوّلین تعارف نگار" "غالب اور غالب تخلص کے اردو شعرا" "غالب کی یادگار قایم کرنے کی اولین تجویز" ایسے مضامین ہیں جو فرمان صاحب کی تحقیقی کاوشوں کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"غالب شاعرِ امروز و فردا" میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی محققانہ کاوشوں سے کلام غالب اور اس سے وابستہ بعض اہم جزئیات کے بارے میں گرانقدر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے غالب کی شاعری اور اس کی فکر کے بعض اہم پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے" لے

اُردو کی منظوم داستانیں" فرمان صاحب کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ مثنوی کے موضوع پر فرمان صاحب کی دو کتابیں اور بھی ملتی ہیں۔ جن کے نام دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ" اور "نواب مرزا شوق لکھنوی کی تین مثنویاں" ہیں۔ یہ کتابیں "اردو کی منظوم داستانیں" ہی کے مختلف ابواب ہیں جنھیں علیحدہ کتابی شکل میں شایع کروایا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں۔

"مثنوی کے ضمن میں ایک بہت مبسوط اور تحقیقی کام ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ اُردو کی منظوم داستانیں" (کراچی ۱۹۷۱ء) ہے جس میں آغاز یعنی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" سے ۱۸۷۰ء تک لکھی جانے والی تمام اہم اردو مثنویوں اور منظوم داستانوں کا تاریخی تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ شامل ہے" ٢ے

"قمر زمانی بیگم" فرمان صاحب کی ایک اور تحقیقی کاوش ہے۔ قمر زمانی بیگم ان خطوط کا مجموعہ ہے جو شاہ دلگیر اور نیاز فتح پوری نے ایک دوسرے کو لکھے۔ فرمان صاحب کی اس کتاب سے پہلے کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ قمر زمانی بیگم کون ہیں فرمان صاحب کی اس کتاب سے پہلے ملک رام اور مجنوں گورکھپوری کے مضامین ملتے ہیں۔ جن میں قمر زمانی بیگم کا ذکر کیا گیا تھا۔ لیکن وہ بھی ان کی شخصیت سے مکمل طور پر پردہ نہ اٹھا سکے۔ فرمان صاحب نے اس کتاب کے ذریعے یہ راز کھولا کہ نیاز فتحپوری، قمر زمانی بیگم کا روپ دھار کر شاہ دلگیر کو خط لکھتے تھے۔ فرمان صاحب نے اپنی کتاب میں قمر زمانی بیگم کی شخصیت کے بارے میں تمام معلومات فراہم کیں۔ فرمان صاحب نے وہ سارے رسالے جمع کیے جس میں قمر زمانی بیگم کے مضامین وغیرہ موجود تھے۔ فرمان صاحب اپنی اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"قمر زمانی بیگم کا کسی کو علم نہیں تھا۔ ان کے خطوط بھی میں سامنے لایا۔ میں نے سارے رسالے

لے "ڈاکٹر فرمان فتحپوری" ماہنامہ محفل لاہور جنوری ۱۹۷۹ء ص ۴۴

٢ے اردو میں اصول تحقیق، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش ص ۳۷۳، جلد دوم

جمع کیے اور اس میں میرا بڑا خونِ جگر صرف ہوا۔"[۱]

تصانیف میں تحقیقی لحاظ سے تذکروں کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اردو میں تحقیقی کام تذکروں کی مدد سے آگے بڑھا ہے چناں چہ محققین نے تذکروں کو مرتب کرنے اور ان کی معلوماتی و سوانحی حیثیات متعین کرنے میں خاص دلچسپی لی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل تذکروں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، حبیب الرحمٰن خاں شیرانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر سید محمود، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد تذکروں کی اہمیت کا احساس ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مرتبہ "نگار" کے تذکروں کا تذکرہ نمبر نے اجاگر کیا۔ اس نمبر کی اشاعت نے اردو تذکروں کی اہمیت نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فرمان صاحب نے تذکروں کا تذکرہ نمبر مرتب کرنے کے بعد اس موضوع سے اپنی وابستگی کو ختم نہیں کیا بلکہ تذکروں کی تحقیق کے کام کو مستقل مزاجی سے جاری رکھا۔ چناں چہ اس موضوع پر فرمان صاحب کی جامع کتاب "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" ۱۹۷۲ء میں شایع ہوئی۔ فرمان صاحب کی اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں۔

> "اس موضوع پر بلاشبہ اب تک سب سے وقیع اور جامع کام ہے۔ اس میں تذکرہ نگاری کے ارتقا کا جائزہ بھی تحریر کیا گیا ہے اور آبِ حیات کی تصنیف تک لکھے جانے والے تقریباً تمام تذکروں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح میر کے "نکات الشعرا" سے "آبِ حیات" تک لکھے جانے والے سب ہی اہم اور معلوم تذکروں کے بارے میں تمام ضروری معروضی و موضوعی معلومات اس تصنیف میں یکجا ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف پر جامعہ کراچی نے ڈی۔ لٹ کی سند بھی تفویض کی ہے اور ادبی دنیا میں اس کی خاطر خواہ ستائش بھی ہوئی ہے۔"[۲]

اپنی اس کتاب میں فرمان صاحب نے بعض تذکرے بھی متعارف کروائے ہیں۔ مثلاً "ارمغانِ گوکل پرشاد" اور "تذکرۂ بشیر" کا تعارف اس کتاب کے توسط سے ہوا۔ ان کے علاوہ عبدالحی صفا بدایونی کے تذکرہ "شمیم سخن" کی دو جلدوں کا تعارف بھی فرمان صاحب نے ہی کروایا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری اپنے موضوع پر ایک ایسی جامع کتاب ہے جسے بلاشبہ تذکروں کے مطالعے میں سب سے اہم اور وقیع تالیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب تک اس موضوع پر صرف ڈاکٹر سید عبداللہ کی ایک چھوٹی سی کتاب دستیاب تھی لیکن ڈاکٹر فرمان صاحب نے اور جملہ سورس سے کام لے کر نہ صرف یہ کہ تذکروں کی تاریخ مکمل کی بلکہ نقد ادب میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت بھی متعین کی ہے۔"[۳]

"زبان اور اردو زبان" اردو زبان کے بارے میں ایک تحقیقی تصنیف ہے۔ چوں کہ فرمان صاحب کا اردو زبان و ادب کی تدریس سے گہرا تعلق رہا ہے اس لیے لسانیات ان کی خصوصی دلچسپی کے دائرے میں شامل ہے اس حوالے سے دیکھیں تو زبان اور اردو زبان لسانی تحقیق کا ایک خوب صورت مظہر ہے۔ "ہندی اردو تنازع" اور "اردو املا اور

---

[۱] ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے ایک ملاقات، ۲۸۔ مئی ۱۹۹۰ء

[۲] اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش ص ۳۶۷

[۳] ڈاکٹر فرمان فتح پوری" ماہنامہ محفل لاہور، جنوری ۱۹۷۹ء ۴۴

رسم الخط" بھی لسانی تحقیق کے دائرے میں آتی ہیں" ہندی اردو تنازع "میں فرمان صاحب نے ہندی اور اردو زبانوں کے جھگڑے کو برصغیر پاک و ہند کی سیاست کے پس منظر میں دیکھا ہے اور" اردو املا، اور رسم الخط میں فرمان صاحب نے اردو املا اور رسم الخط کے اصول و مسائل سے بحث کی ہے۔ اردو زبان سے دل چسپی کا ایک مظہر ان کا اردو ڈکشنری بورڈ سے منسلک ہونا بھی ہے۔ لغت کی تیاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ محقق زبان کے اصول و مسائل سے پوری طرح واقف ہو اور فرمان صاحب اس شرط میں پورا اترتے ہیں۔

"میرانیس۔ حیات و شاعری" بھی فرمان صاحب کی محققانہ کوششوں کا ایک مظہر ہے۔ فرمان صاحب نے انیس کی زندگی کے بارے میں بعض دعوؤں کو غلط ثابت کیا ہے۔ انیس کا شجرۂ نسب بھی بیان کیا ہے، اور اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کی ہے۔

"اقبال سب کے لیے" میں فرمان صاحب نے اقبال کی زندگی کے بارے میں بعض اہم معلومات فراہم کی ہیں اور بڑی تحقیق سے سارا مواد اکٹھا کیا ہے۔ اور ان کی زندگی کے معمولات اور عادت و اطوار پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فرمان صاحب نے اقبال کی نثری اور شعری کتابوں کی تفصیل بھی دی ہے اور ان کے کلام کے بعض اہم پہلوؤں پر بحث بھی کی ہے۔

"اردو افسانہ اور افسانہ نگار" بھی فرمان صاحب کی تحقیقی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب میں پہلے فرمان صاحب نے افسانہ نگاری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے اس کا جائزہ لیا ہے اور پھر دوسرے حصے میں اردو کے اہم افسانہ نگاروں کے متعلق مختصر معلومات فراہم کی ہیں اور ان کی زندگی کا پہلا افسانہ لکھ دیا ہے۔

"اردو کی نعتیہ شاعری" بھی فرمان صاحب کی ایک محققانہ کاوش ہے۔ اس کتاب میں فرمان صاحب نے اردو نعتیہ شاعری کا سرسری جائزہ لیا ہے اور اردو نعتوں کے نمونے بھی دیے ہیں۔

فرمان صاحب کی تحقیق کو ہم دو خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک قسم کی تحقیق تو وہ ہے جو انھوں نے ان موضوعات پر کی ہے جن پر ان سے پہلے بہت کم لکھا گیا۔ جیسے" اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" اور "اردو رباعی ؛ فنی و تاریخی ارتقاء" وغیرہ۔ فرمان صاحب کے" نگار" کے تذکروں کا تذکرہ" نمبر سے پہلے اس موضوع پر بہت کم لوگوں نے لکھا تھا لیکن فرمان صاحب نے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ اسی طرح اردو رباعی پر بھی کوئی خاص کام نہیں ملتا تھا۔ فرمان صاحب نے اس موضوع پر لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور سرخرو بھی ہوئے ان کی کتاب" اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقار" اس موضوع پر مستند اور جامع کتاب مانی جاتی ہے۔

دوسری قسم کی تحقیق وہ ہے جس میں فرمان صاحب نے ایسے موضوعات کو منتخب کیا ہے جن پر پہلے لکھا جا چکا ہے اور فرمان صاحب نے ان محققین کی تحقیق کا جائزہ لیتے ہوئے اسے نو دریافت مسلم حقایق کی روشنی میں دیکھا ہے یا نئے مآخذ کی روشنی میں پرکھا ہے۔ جیسے میر انیس۔ حیات اور شاعری،" غالب شاعر امروز و فردا" اور" اقبال سب کے لیے" وغیرہ۔ میرانیس کی زندگی پر بہت سی کتابیں چھپیں لیکن ہر کتاب میں انیس کی زندگی کے بارے میں نئی باتیں موجود تھیں۔ فرمان صاحب نے ان تمام تحقیقات کا جائزہ لیا اور صحیح معلومات اپنی کتاب کے ذریعے لوگوں تک پہنچائیں۔

فرمان صاحب کی تحقیق کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ تحقیق و تنقید کو ساتھ ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں اور ادبی تخلیق کے لیے دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔

تحقیق و تنقید کے فرق پہ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"یوں تو تحقیق و تنقید میں با اعتبار معنی کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ۔ تحقیق کے معنی حق کی تلاش و تصدیق کے ہیں ۔ تنقید کا لفظ بھی کم و بیش یہی معنی دیتا ہے ۔ پھر بھی علمی و ادبی مباحث میں یہ الفاظ نمایاں معنوی فرق کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ۔ تحقیق عموماً خارجی و تاریخی واقعات اور الفاظ و محاورات کی چھان بین پر نظر رکھتی ہے اس کے برعکس تنقید کسی ادبی تخلیق کے حسن اندروں کو نگاہ میں رکھ کر اس کے معیار و حلقۂ اثر کا تعین کرتی ہے ۔ لیکن دوسرے علوم پہ قیاس کرکے ادب کو تحقیق و تنقید کے خانوں میں بانٹ کر دیکھنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا ۔"[1]

فرمان صاحب کی تصانیف میں تحقیق اور تنقید ساتھ ساتھ چلتے ہیں جو مضامین تنقیدی ہیں ان میں بھی تحقیق کا عنصر موجود ہے اور جو خالصتاً تحقیقی ہیں ان میں بھی تنقید کی چاشنی پائی جاتی ہے ۔ تحقیق و تنقید کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے فرمان صاحب لکھتے ہیں ۔

"جب تک وثوق سے یہ معلوم ہو کہ کوئی ادب پارہ کس کی تخلیق ہے کب اور کن حالات میں وجود میں آیا ہے اور جس زبان سے اس کا تعلق ہے اس میں زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت کے کیا اصول ہیں ۔ اس وقت تک تنقید کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اسے قدم آگے بڑھانا ہے تو تحقیق کا سہارا لینا ہوگا ۔ یہی حال تحقیق کا ہے ۔ تنقیدی شعور سے بے نیاز رہ کر وہ اپنی ادبی اہمیت نہیں منوا سکتی اگر اسے ادب کا مستقل جزو بننا ہے تو غیر ضروری مسائل کو نظر انداز کرکے صرف اہم اور افادی امور کو ادبی تحقیق کا موضوع بنانا ہوگا ایسے اہم اور افادی امور جن سے تنقید کی نئی راہیں کھلتی ہیں اور جن کے وقوف سے ادب کے عام قارئین ایک قسم کی طمانیت محسوس کرتے ہیں ۔"[2]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کی ایک خاصیت یہ ہے کہ جس موضوع کو وہ اپنی تحقیق کے لیے منتخب کرتے ہیں اس کے افادی نقطۂ نظر کو پہلے اپنی نظر میں رکھتے ہیں اگر وہ موضوع واقعی تحقیق طلب ہوتا ہے اور اس سے ادب میں نئی راہیں کھلنے کا امکان ہوتا ہے تو فرمان صاحب اسے اپنی تحقیق کے لیے منتخب کر لیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں فرمان صاحب کے تحقیقی سرمائے میں صرف اور صرف ادبی افادیت کے حامل تحقیق طلب موضوعات ہی نظر آتے ہیں ۔ مثال کے طور پر فرمان صاحب کی کتاب "تحقیق و تنقید" میں ایک مضمون "جگر لخت لخت" ہے جس میں فرمان صاحب نے قاضی عبدالودود پہ یہ اعتراض کیا ہے کہ غیر معروف شعرا پر ان کا تحقیقی کام بہت زیادہ ہے جس سے ادب کو کوئی خاص فایدہ نہیں پہنچا اور قاضی صاحب جیسے معتبر محقق کی صلاحیتیں اس طرح ضایع ہو رہی ہیں ۔

فرمان صاحب کی تحقیق کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ بغیر کسی مستند اور معتبر حوالے کے نہ تو کسی روایت کو صحیح مانتے ہیں اور نہ ہی خود کوئی بات بغیر حوالے کے کرتے ہیں ۔ فرمان صاحب کی تحقیق کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں ۔

---

[1] دیباچہ ۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، ص ، ۷

[2] دیباچہ ۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر فرمان فتحپوری ص ۷ ، ۸

"ان کی تنقید و تحقیق کی بنیادی خصوصیت منطقی خوش استدلالی ہے۔ منطق، اگر خوش استدلال نہیں تو اس کا عدم وجود برابر ہے۔ سچی، صحیح اور امانت دارانہ تحقیق و تنقید کا راستہ ہی خوش استدلالی کا راستہ ہے اور یہ بات ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

فرمان صاحب، بات ایک چھوٹے سے دعوے سے شروع کرتے ہیں۔ اس دعوے کی صداقت کے اثبات میں صاف سیدھے اور واضح صغریٰ اور کبریٰ قایم کرتے ہیں اور ان سے ایک صریحی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ فوراً ہی ایک نئے منطقی قیاس کا مقدمہ بنتا ہے اور صغری کبریٰ کی ایک نئی ترتیب کسی اور نتیجے کے استنباط کا ذریعہ بنتی ہے۔ مقدمات، مفرد اور مرکب قضیات کی ترتیب، قیاس، استخراج، استقرار، استنباط اور استنتاج کے کئی مرحلوں سے گزرتی ہوئی یہ منطق بالآخر کسی ایسی دریافت کا سبب بنتی ہے جسے ادب کے مسلمات میں جگہ ملتی ہے۔ فرمان صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین نے منطق کے اسی انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی اور کہی ہیں جنھیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔"[1]

فرمان صاحب کسی موضوع پر اپنی کی ہوئی تحقیق کو حرف آخر نہیں سمجھ لیتے بلکہ اس موضوع کو مسلسل تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ نئے واقعات کا علم ہوتا رہتا ہے۔ چناں چہ ان نئے واقعات کی دریافت سے اس موضوع کے کئی تاریک گوشوں کے روشن ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمان صاحب کسی ایک موضوع پر کتاب لکھنے کے بعد اس موضوع کے بارے میں مزید حقایق جاننے کی فکر میں رہتے ہیں اور یہی ایک سچے محقق کی خصوصیت ہوتی ہے۔ "اردو کی منظوم داستانیں" کے دیباچے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں۔

"مقالے کی تیاری میں حتی الوسع، موضوع کے ہر گوشے کی چھان بین اور ہر پہلو پر بار بار غور کر کے رائے قایم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے باوجود میں کسی رائے کو حرف آخر سمجھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ سائنس ہو یا ادب آج سے نہیں ہمیشہ سے، تحقیق خود تحقیق کی دشمن ثابت ہوئی ہے۔"[2]

فرمان صاحب کی تحریروں میں نہ ہی علمیت کا رعب ہے نہ تو وہ فلسفہ بگھارتے ہوئے نظر آتے ہیں اور نہ ہی قاری کو مرعوب کرنے کے لیے بڑے بڑے الفاظ لے کر آتے ہیں۔ رشید حسن خان تحقیقی مقالات کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے اور صفائی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ اردو تنقید جس طرح انشار پردازی کا آرائش کدہ، بن کر رہ گئی ہے، وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے۔"[3]

---

[1] فورٹ ولیم کالج مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن مطبوعہ یونیورسل بکس ص ۱۲

[2] دیباچہ، اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۱۴

[3] ادبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ از رشید حسن خان، ص ۱۴

فرمان صاحب کی زبان اس شرط پر پورا اترتی ہے ۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرجاتے ہیں ۔ الفاظ کی شعبدہ بازی اور الفاظ کا ہیر پھیر ان کے یہاں نظر نہیں آتا ۔ سیّد وقار عظیم " فرمان صاحب کی تحریروں کے بارے میں لکھتے ہیں "

فرمان صاحب کے منطقی استدلال کا ایک اور وصف یہ ہے کہ کی ایسی متانت اور بردباری ہے جس نے شگفتہ روی اور دل داری کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دمساز بنایا ہے ۔ ان کی تحقیق اور تنقید نے دیانت دارانہ اور محبت آمیز وکالت کو اپنا وظیفہ بنایا اور ہمیشہ خوش بیانی سے اسے پورا کیا ہے۔" لہ

درس وتدریس کے پیشے سے وابستگی کی بنا پر فرمان صاحب کی تحریروں میں یہ خاصیت آگئی ہے کہ وہ اپنی بات کو متعدد دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی دلائل ان کی تحقیق کو زیادہ معتبر اور موقر بنا دیتے ہیں ۔

فرمان صاحب اپنی گراں قدر تحقیقی اور تنقیدی تصانیف کی وجہ سے دنیائے نقد و تحقیق میں مقام احترام و عقیدت پر فائز ہیں ۔ حکومت پاکستان نے ان کی علمی کاوشوں کی بنا پر ان کو "ستارہ امتیاز" کا اعزاز دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ فرمان صاحب سے نسبت پانے کی وجہ سے "ستارہ امتیاز" ہی کی چمک میں اضافہ ہوا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ تمغے اور نشانات کا امتیاز ان شخصیات ہی کی وجہ سے قایم ہوتا ہے جن سے منسوب ہوتے ہیں ۔

لہ فورٹ ولیم کالج مرتبہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن ، ص ۱۳

حکیم نثار احمد علوی

ڈاکٹر فرمان فتحپوری محقق و نقّاد

فرمان صاحب کا نام میں نے سب سے پہلے علامہ نیاز فتح پوری صاحب کے رسالہ "نگار" میں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں فتح پور کے واسطے سے صرف نیاز صاحب سے واقف تھا۔ نگار ہمارے یہاں باقاعدہ آتا تھا اور والد محترم اس کا مطالعہ فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علمی و ادبی مضامین ابتدا میں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتے تھے۔ جب میں اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ گیا تو وہاں کے علمی ماحول کی بدولت نگار کے مطالعہ کا مزید شوق پیدا ہوا اور میں نے گھر سے اس کے پرچے منگا کر مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اب خیال آتا ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ نگار نے تحقیق و جستجو کا ذوق صرف مجھ میں ہی نہیں بلکہ نہ جانے کتنے لوگوں میں پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیا۔

۱۹۶۲ء میں نگار کراچی سے نکلنے لگا اور اس کے مدیر کی حیثیت سے فرمان صاحب کا نام نظر آیا۔ کچھ عرصہ بعد نیاز صاحب کراچی آ گئے اور انھوں نے اس کی ادارت کی بیشتر ذمہ داریاں فرمان صاحب کے سپرد کر دیں۔ ۱۹۶۶ء میں جب نیاز صاحب خالق حقیقی سے جا ملے تو یہ پرچہ مکمل طور پر فرمان صاحب کی ادارت میں نکلنے لگا اور آج تک جاری ہے۔

نگار ایسے عہد ساز جریدے کی ادارت پر فرمان صاحب کا نام دیکھ کر مجھے احساس ہو گیا کہ وہ یقیناً علم و ادب کے رشناور اور تحقیق و تنقید کے مرد میداں ہوں گے۔ پھر میں ان کے مضامین کا برابر مطالعہ کرتا رہا۔ جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ تنقید و تحقیق کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ یہ وصف بہت سے ادیبوں کو میسر نہیں ہوتا ہے۔ وہ روایت کے پرستار ہیں اور اس زمانے میں قدیم اقدار کی بقا کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ان میں ادبی لگن کے ساتھ ذہنی توازن بھی ہے جس سے تعمیری ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔ گہرے سمندروں سے موتی نکالنا اور اسے دنیائے ادب میں پیش کر دینا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ میں ان کی تحریروں اور نگار پاکستان کے ضخیم نمبروں کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا کہ تحریر کا کمال یہ نہیں ہے کہ صرف خیالات میں ندرت ہو بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ قاری اس کو محویت اور دلچسپی سے پڑھے۔ اور وہ افکار و نظریات پر اثر انداز ہو اور رواروی میں سر سے نہ گزر جائے۔ فرمان صاحب کی تحریر میں یہ بات اکثر ملتی ہے کہ پڑھنے والا اس سے تاثر ضرور حاصل کرتا ہے۔ تحریر کی خشکی سے پڑھنے کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ ان کے مضامین میں کہیں تکرار مضامین بھی ملتی ہے لیکن یہ تکرار عیب نہیں ہے بلکہ خوبی کی حامل ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ تو اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ اپنی بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔ فرمان صاحب ۱۹۵۰ء سے برصغیر کے ادبی رسائل میں مقالات لکھ رہے ہیں اور اب تک تقریباً تین سو مقالے سپرد قلم کر چکے ہیں۔

فرمان صاحب سے سرسری ملاقاتیں تو ہوتی رہیں اور کبھی کبھی ان کی قیام گاہ کراچی یونیورسٹی بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ان ملاقاتوں میں جب بھی کسی ادبی مسئلہ پر وہ اظہار خیال کرتے تو اس میں سے اپنے کام کی بات گھر آ کر نوٹ کر لیتا تھا۔ ایک نشست میں تذکروں کی بات آئی تو انھوں نے کہا کہ علمی و ادبی گھرانوں کے افراد اور جب تک مختلف قصبوں اور شہروں کے لوگ اپنے اپنے اسلاف کی ذہنی کاوشوں اور تہذیبی قدروں کو کتابی صورت میں محفوظ کر لینے کی ذمہ داری قبول

نہ کریں گے اور اپنے بزرگوں کے گم شدہ کارناموں کے اجزا کا سراغ نہ لگائیں گے مسلمانانِ پاک و ہند کی ذہنی زندگی کی کوئی معتبر تاریخ مرتب نہ ہو سکے گی۔" سخن وران کاکوری" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو اس زمانے میں مرتب ہوئی ہے۔

ایک دن نگار کے پرانے پرچے زیرِ مطالعہ تھے کہ میں نے ان کے کسی مضمون میں لکھا دیکھا کہ "نقاد کی زندگی یہ نہیں ہے کہ اس کی رائیں درست ہوں اور ان کو مان لیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کی رائے کا ہمیشہ حوالہ دیا جائے" اور اس سے اختلاف کیا جائے۔" ان کے اس جملے کی وسعت اور گہرائی نے ان سے ایک تفصیلی ملاقات کرنے کا شوق پیدا کر دیا اور جی چاہا کہ چند ادبی مسائل پر ان کا نقطۂ نظر معلوم کیا جائے۔

چناں چہ اپریل ۱۹۸۰ میں ایک دن ان کے نئے مکان گلشن اقبال پر پہلے سے اطلاع کیے بغیر صبح صبح پہنچ گیا گھنٹی بجائی، چند منٹ کے بعد فرمان صاحب خود تشریف لائے اور مجھے اور میرے برادر محترم فطرت کاکوروی صاحب کو اپنے ملاقاتی کمرے میں بڑے تکلف سے بٹھایا۔

میانہ قد، جسم دبلا نہ موٹا۔ لیکن وقت کسرتی ہونے کی جھلک نمایاں تھا۔ چوڑی ابھری پیشانی کتابی چہرہ، گندمی رنگ۔ بیلدار لکھنوی کرتہ زیب تن، اور پاجامہ علی گڑھ کی روایت کا غماز، غالباً دوپلی ٹوپی بھی پہنتے ہوں گے اگرچہ اس وقت سر پر نہ تھی۔ غرض لباس سے اودھ کی چھاپ ظاہر تھی چہرہ پر غور و فکر کے آثار بھی نمایاں تھے۔ فرمان صاحب قہقہہ خوب لگاتے ہیں اور ان کی گفتگو میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر طبقہ کے پسندیدہ اور محبوب ہیں۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا اور پہلا سوال یہ کیا۔

"ایک نقاد میں بنیادی خصوصیات کیا ہونا چاہئیں؟"

انھوں نے فرمایا: نقاد کی بنیادی خصوصیت میری نظر میں یہ ہے کہ اس کے ذہن کو بنیادی طور پر تخلیقی ہونا چاہیے۔ ادب علوم سے قوت حاصل کرتا ہے لیکن ادب علم سے ایک الگ چیز ہے۔ علم یا علمی کتابوں کا خاصہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ لکھنے والے کے ذاتی جذبے اور احساس سے زیادہ سے زیادہ دور ہو، تاریخ، فلسفہ، طب، معاشیات جیسے علوم پر زیادہ مستند اور سچائی سے قریب تحریریں وہی قرار پائیں گی، ادیبانہ ہوں گی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی جن میں صداقتوں کی تلاش میں جذبات کا کم سے کم دخل ہو۔ لیکن تخلیقی ادب یا فنون کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ فن یا ادب یا تخلیقی ادب جو بھی نام دیں اس کے لیے ضروری ہے کہ چیزوں کو احساس اور حوالے سے دیکھا جائے یعنی تحریر پر جتنی خوب صورت اور جذبات کی عمدہ چھاپ ہوگی اسی نسبت سے وہ بہتر فن یا ادب پارہ کہلائے گا۔ لیکن اگر یہی چیزیں کسی علمی کتاب میں داخل ہو جائیں تو اس کا نقص ٹھہرے گا۔ جب کوئی ادبی نقاد ادب کو پرکھتا ہے یعنی تخلیقی فنون کو پرکھتا ہے تو گویا اس کی پرکھ بنیادی طور پر جذبہ اور احساس کی سچائیوں کی پرکھ ہوتی ہے۔ اس لیے ناقد علوم پر دسترس رکھنے کے علاوہ اپنے عہد کے مسائل پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ جتنا پختہ تخلیقی شعور رکھتا ہوگا اسی نسبت سے وہ ادب کو بہتر طور پر پرکھ سکے گا اس لیے ادب میں منطقی صداقتوں کو تلاش نہیں کیا جاتا اور نہ کیا جانا چاہیے بلکہ جذباتی اور محسوساتی صداقتوں کو تلاش کیا جانا چاہیے گویا نقاد محض الفاظ کی سطح پر یا لفظوں میں بیان کیے ہوئے واقعات کی سطح پر چیزوں کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ لفظوں کے نہاں خانے میں داخل ہو کر فن کار کے پنہاں خزانے کی کھوج لگاتا ہے اور اپنی تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت ادیب یا فنکار کی ان تحت الشعوری اور لاشعوری باتوں کو بھی گرفت میں لے لیتا ہے جو شعور کی آنکھ بچا کر کسی فن کار کے یہاں در آتی ہیں۔ تو جیسے کسی فن کار یا تخلیقی ادیب کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ خواہ بہت بڑا عالم و فاضل نہ ہو لیکن اسے قوت تخلیق اکتسابی طور پر یا عطیۂ الٰہی کے طور پر میسر ہو۔ جب ہی وہ اچھا

شاعر یا ادیب بن سکتا ہے۔ اسی طرح سے نقاد کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ تخلیقی قوت بھی رکھتا ہو اور تخلیقی عمل کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے بھی واقف ہو۔

نقاد کے لیے دوسری بات یہ ضروری ہے کہ وہ ادب، زندگی اور دوسرے زندگی کو متاثر کرنے والے عصری علوم اور میلانات سے واقفیت رکھتا ہو۔ نقاد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ادب کی جملہ اصناف پر رائے رکھنے یا دینے کا اہل ہے۔ یہ اہلیت اسی وقت قابلِ قبول ہو سکتی ہے جب واقعی اس کی تحریر سے یہ اندازہ ہو کہ اس نے جس فنکار یا فن پارے پر قلم اٹھایا ہے وہ اس کے عوامل اور اس کے ایسے مضمرات سے جو بعد میں رونما ہوں گے پوری طرح واقف اور آگاہ ہے گویا نقاد کے لیے تخلیق فن کار سے آگے بڑھ کر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان سارے علوم متداولہ پر کسی نہ کسی حد تک نظر ضرور رکھتا ہو جن سے کسی خاص عہد کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جس ادب کو اسے پرکھنا ہے وہ کسی نہ کسی عہد کی زندگی ہی کا مفسر، ترجمان اور نقاد ہوتا ہے۔

تیسری بات نقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ ادب جو تلاشِ حسن کا دوسرا نام ہے اور اپنا اظہار زبان اور الفاظ سے کرتا ہے۔ لفظوں کے ذریعہ سے اگر اظہارِ حسن نہ ہو تو گویا ادب میں نقص رہے گا۔ اس لیے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ نقاد کو خیالات و فکر کے ساتھ زبان کا بھی نباض ہونا چاہیے۔ ادب میں یہ بات بہت اہم ہے کہ بات کتنی بلندی اور کتنے تفکر سے کہی گئی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بات کسی طرح اور کس طور پر کہی گئی ہے۔ تخلیقی ادب کا اپنا ایک مخصوص پیرایہ ہوتا ہے اگر اس پیرایہ میں یہ بات نہ کہی گئی ہو تو وہ ادب نہیں کہلائے گی۔ گویا صرف یہی نہیں کہ کیا کہا گیا ہے۔ بلکہ نقاد کو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ کس انداز سے کہا گیا ہے۔ لفظی پرکھ کے اس سلسلے میں صوتیات کا مطالعہ زبان کے قواعد کا مطالعہ زبان کی حقیقی و مجازی سطحوں کا مطالعہ، لغات کی تبدیلیوں کا مطالعہ، عروضی آہنگوں کا مطالعہ، قوافی اور ردیف کے لوازم سے واقفیت بھی ضروری ہو جاتی ہے ورنہ ان چیزوں سے بے خبر نقاد صرف منطقی فکر و فلسفہ کی بنیادوں پر ادب پر حکم صادر کرتا رہے گا۔ جس طرح ایک پینٹر یا مصور جب تک برش اور رنگ کے اثرات کی موشگافیوں سے واقف نہیں ہو گا اچھی تصویر کا خالق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نقاد کی دسترس سے تنقید بھی دور دور رہے گی۔

بھونڈے پن سے کوئی بات کہنے کا نام ادب نہیں ہے۔ آپ جو نظریہ بھی چاہیں اختیار کریں اس میں سچا ادب وہی ہے جو تہذیب کی ہر سطح کو قابلِ قبول ہو اور بلا امتیاز نسل و رنگ، مذہب اور سن و سال پڑھا جا سکا غرض تین چیزیں نقاد کے لیے بنیادی ہیں۔

۱۔ تخلیقی ذہن

۲۔ عصری علوم اور زندگی سے واقفیت جس سے ادب متاثر ہوتا ہے۔

۳۔ زبان کے نکات کا مطالعہ اور قدیم ادب کا مطالعہ۔

ان تمام باتوں کے باوجود دیانت، غیر جانب داری بہر نوع لازمی کہ وہ کس رنگ نسل طبقہ یا ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک اچھے نقاد کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ اپنی غیر جانب داری کی وجہ سے ایک فن پارے میں مستقبل کے امکانات کو محسوس کر لیتا ہے اور اس کی خوشبو سونگھ لیتا ہے اور ایسی باتوں کی نشان دہی کر لیتا ہے جو عام لوگ محسوس نہیں کر پاتے۔

یونان کے ایک شاہی دربار میں، مصوری کا مقابلہ تھا، ایک مصور نے ایک آدمی کے ہاتھوں تصویر کی

صورت میں انگور کا خوشہ پیش کیا۔ انگور کا خوشہ اصل سے اس قدر مطابقت رکھتا تھا کہ پرندے اس پر ٹوٹ پڑے۔ یہ مصوری کا کمال تھا اس لیے مجمع سے واہ واہ سبحان اللہ کی آواز بلند ہوئی۔ لیکن ایک ناقد نے بلند آواز سے کہا کہ سب سے ناقص تصویر یہی ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ جن ہاتھوں میں انگور کا خوشہ دکھایا گیا ہے وہ اصل سے قریب تر ہرگز نہیں ہیں اگر ایسا ہوتا تو پرندے کبھی اس خوشے کے قریب نہ آتے' یہ بات لوگوں کے دل لگی اور مجمع نقاد کی نظر کا قائل ہوگیا۔

میرے خیال میں یہی صحیح تنقید اور نکتہ رسی کی مثال یہی ہے۔ مختصر طور پر یہ ہے کہ اوپر کی جملہ شرائط کے ساتھ ساتھ جس نقاد میں جس نسبت سے ژرف بینی نکتہ رسی اور بلندیاں نظر آئیں گی اسی نسبت سے نقاد کا مقام متعین کیا جاسکتا ہے۔

فرمان صاحب نے جس تفصیل سے اس سوال کا جواب دیا اس پر میں نے ان کا بھرپور شکریہ ادا کیا۔ اور چلتے چلتے دو سوال اور کر دیئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ خود اپنی تحریر پر تنقید کر سکتے ہیں؟

انھوں نے فرمایا کہ میں ہر تحریر کا پہلا نقاد خود ادیب اور شاعر کو مانتا ہوں، نقاد کو نہیں مانتا ہوں۔ شاعر اور ادیب اپنے گرد و پیش پر تنقیدی نظر ہی ڈالتا ہے اور اس تنقیدی نظر سے اس پر ایک احساس یا جذبہ مرتب ہوتا ہے یہ اس عمل میں لاشعوری عمل زیادہ ہوتا ہے جب تخلیق سامنے آجاتی ہے تو پھر شاعر یا مضمون نگار ایک شعوری نظر اس پر ڈالتا ہے اور یہ ہی اس کی تنقیدی نظر ہوتی ہے بالکل اسی طرح کوئی نقاد اپنی کسی تحریر کو بھی دوبارہ پرکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جس طرح شاعر کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی تخلیق کو بہتر سمجھے یا معیاری یا غیر معیاری قرار دے اسی طرح کی مشکل نقاد کے سامنے بھی ہوتی ہے۔

آخری بات جو میرے ذہن میں آئی اور میں نے ان سے دریافت کی وہ یہ تھی کہ "سب سے پہلا نقاد کون تھا؟" انھوں نے فرمایا کہ "میرے خیال میں خداوند قدوس ہی اوّلین نقاد ہے کہ اسی نے خیر و شر نیکی اور بدی۔ ظلمت و روشنی، جہل و عرفان اور مردانیت اور شیطانیت میں فرق کرنا سکھایا ہے اور اس کے حدود متعین کیے ہیں' اس کے رموز سے آگاہ کیا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ حتیٰ کہ شعر و ادب کے سلسلہ میں بھی سورۃ الشعرا کے ذریعہ اچھے برے ادب اور اچھے برے شاعر میں تمیز کرنا بتایا۔ اسی تعلق سے ہمارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شعر فہمی اور شعر کی داد دینا یا شعر کو پسند کرنا تنقیدی شعور کا ثبوت ہے۔

فرمان صاحب کا علم و فن تازہ اور حاضر ہے۔ میں نے دوران ملاقات جب بھی ان سے کسی ادبی مسئلہ پر رائے دریافت کی انھوں نے بلا کسی توقف کے اظہارِ خیال کیا۔ عام طور پر ادیبوں اور نقادوں کو مطالعہ اور حوالوں کے لیے وقت درکار ہوتا ہے یا وہ سوالات پر غور و فکر کے بعد جواب دینا مناسب خیال کرتے ہیں میں نے ان سے ایک ہی ملاقات میں تین گھنٹے تک ان کی علمی اور تنقیدی مسائل پر دل چسپ اور تحقیقی گفتگو سے اپنی ادبی تشنگی کی پیاس بجھائی لیکن انھوں نے کسی قسم کی بیزاری کا تاثر نہیں دیا میں ہی وقت نہ ہونے کی وجہ سے مزید سوالات نہیں کر سکا ورنہ وہ ان پر بھی روشنی ڈالتے۔ ان کی تحریر، تقریر اور گفتگو میں جو رنگینی حسن اور شیرینی ہے وہ میرا خیال ہے فیضان اَوَدھ ہے، جہاں انھوں نے کافی وقت اپنی عمر کا گزارا ہے۔

ابھی تک یہ بات شاید کسی کو معلوم نہ تھی کہ فرمان صاحب شاعری بھی کرتے ہیں لیکن جب میں نے اصرار کے ساتھ اس بات کا کھوج لگایا تو معلوم ہو کہ وہ شاعری بھی کرتے ہیں اور ان کی ایک بیاض بھی ہے۔ اس بیاض میں سے انھوں نے مجھے دو نظمیں سنائیں جو بعد کو میں نے تحریر کرلیں، درج ذیل ہیں:۔

پہچان میں آئے

چاہت کے پرندے دل ویران میں آئے
صیاد کسی صید کے ارمان میں آئے

وہ چاند ہے پیچ مچ کا تو پھر اس سے کہو نا
اُترے مرے گھر میں کبھی دالان میں آئے

سورج ہے تو کچھ اپنی تمازت کی رکھے لاج
پگھلائے مجھے برف کی دکان میں آئے

سایہ ہے تو گزرے کسی دیوار کو چھو کر
ہے دھوپ تو اونچان سے ڈھلوان میں آئے

نغمہ ہے تو پھوٹے کبھی سازِ رگِ جاں سے
آواز کوئی ہے تو مرے کان میں آئے

ہے جسم تو بن جائے مری روح کا مسکن
ہے جان تو پھر اس تنِ بے جان میں آئے

ساحل ہے تو نظارہ کی دعوت بھی نظر کو
ہے موجِ بلاخیز تو طوفان میں آئے

شعلہ ہے تو پگھلائے مرے شیشۂ جان کو
ہے بادۂ خوں ناب تو مژگان میں آئے

امرت ہے تو چھلکے لب لعلیں سے کسی کے
ہے زہر تو بازار سے سامان میں آئے

ہے درد تو سیلاب بنے پار لگائے
درماں ہے تو بن کر دوا فنجان میں آئے

غنچہ ہے تو کھل جائے مرے دل کی صدا پہ
خوشبو ہے تو زخموں کے گلستان میں آئے

کہتی ہے تو احساس کی کلیوں سے بھی کھیلے
ہے پھول تو تخیل کے گل دان میں آئے

فرحانؔ وہ جس آن میں جس رنگ میں چاہے
آئے مگر اتنا ہو کہ پہچان میں آئے

المیہ

ایک ڈر
میرے احساس کی کچی سوندھی سی شفاف دالان میں
بے صدا بے ہوا، بے طلب، بے سبب
خواب میں وا ہوا
ایک توس و قزح، یاد کی پیار کی
شانۂ درخ پہ ہنستی کے لہرا گئی
رنگ اڑنے لگے

پھول کی پتیاں جاگ اٹھیں خواب سے
تتلیاں بن کے اڑنے لگیں
کتنی معصوم کلیاں، بصد دلبری
پھول بننے کو پہلو بدلنے لگیں
اور رنگوں کا یہ عالم کہ
رنگوں کے جھرمٹ میں دولہا بنے
بنت مہتاب سے
چھیڑ کرنے لگے
مصحف و آرسی کا سماں بن گیا
یہ سماں چاندنی سے نہ دیکھا گیا
شب کے پردے میں ناگن بنی ڈس لیا

پروفیسر حسن وقار گل

ڈاکٹر فرمان فتحپوری ـــ ممتاز محقق، نقاد اور دانشور

حسن وقار گل: ڈاکٹر صاحب موجودہ عہد میں آپ بلاشبہ ان چند اکابر میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے تخلیق اور تحقیق دونوں میں دل چسپی لی ہے۔ اس موقع پر کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ کی نظر میں خود ادب کیا ہے؟

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: میرے نقطۂ نظر کے مطابق خیالات، مشاہدات، تجربات اور واقعات کو پوری طرح محسوس کر کے شدتِ جذبات کے ساتھ لفظی جامہ پہنانے کا نام ادب ہے۔

حسن وقار گل: کیا اس اعتبار سے ادب کی تقسیم ممکن ہے؟

ڈاکٹر فرمان: ادب کی تقسیم اس کی اوصاف کے مطابق تو کی جا سکتی ہے لیکن ادب صرف ادب ہوتا ہے اس کی قسمیں نہیں ہوتیں صرف سمجھنے سمجھانے کے لیے تقسیم کی جاتی ہے، معیاری اور غیر معیاری سطحیں ہوتی ہیں لیکن ادب صرف ادب ہوتا ہے اور ہر ملک و قوم کا تشخص وہاں کے ادب میں ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادب کس قوم اور ملک سے تعلق رکھتا ہے۔

حسن وقار گل: وہ کون سی خصوصیات ہیں جو پاکستانی ادب کو بھارتی ادب سے ممتاز کرتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان: بظاہر یہ کہا جاتا ہے کہ بھارت اور پاکستان کی تہذیبی زندگی ایک سی ہے۔ مسلمانوں کی جو قومیت ہے وہ ملت کی مسلم حیثیت سے ہے جس میں دنیا بھر کے تمام مسلمان شامل ہیں لیکن ہماری سوچ بحیثیت پاکستانی ہندوستان کے مقابلے میں صرف اس لیے مختلف ہے کہ ہم ادب کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جب کہ ہم نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جو پاکستانی ادب کو بھارت کے ادب سے ممتاز کر سکے سوائے اس بات کے کہ ہم تخلیقی عمل میں ان سے آگے ہیں جب کہ وہ تحقیقی عمل میں ہم سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

حسن وقار گل: اس اعتبار سے پاکستانی ادب کی اصطلاح کن اعتبار سے معنی خیز ہے؟

فرمان صاحب: پاکستان کا ادب خواہ کسی زبان میں ہو پاکستانی ادب ہوگا اس ادب میں پاکستانی ادب کی بو باس ہونی چاہیے یعنی شعر اور تحریر خود ظاہر کرے کہ وہ کس ملک و ملت اور کس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔

حسن وقار گل: کیا ادب اسلامی بھی ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: ادب کو صرف سمجھنے سمجھانے کی حد تک مختلف نام دے دیئے جاتے ہیں یہ ادب کی موضوعاتی تقسیم ہے۔ اگر ایک موضوع کسی فن پر حاوی ہوتا ہے تو ہم اسے سمجھنے کے لیے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ فلاں ادب ہے۔

حسن وقار گل: ایسے کون سے عوامل ہیں جو ادب کے فروغ میں مدد دیتے ہیں؟

فرمان صاحب: خارجی زندگی میں کوئی بھی محرک ہو جو جذبے کو تحریک میں لاتا ہو۔ جو ادب لکھنے پر مجبور کرے وہ چاہے اسلام ہو، ملک ہو، کوئی فرد ہو یا تجربہ جتنا قوی محرک ہوگا اتنا ہی قوی ادب ہوگا۔ چاہے حادثہ کسی کی موت ہو لیکن ذہنی آزادی اور ذہنی دباؤ لازم و ملزوم ہیں جو ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

حسن وقار گل: اردو زبان کے فروغ میں نثر زیادہ قوی عنصر ہے یا نظم؟

فرمان صاحب: کسی بھی زبان کے ادب میں جو کردار نظم کا ہے ظاہر ہے نثر کا نہیں چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال، ٹیگور، سیکسپیئر وغیرہ تمام ادب کے فروغ کا ذریعہ اپنی شاعری کو بناتے ہیں۔ زبان اور ادب کا معیار ہی شاعری ہے لیکن تخلیقات کے دوسرے پہلو بھی ہیں لیکن لطیف ترین حصہ شاعری ہے اور کسی بھی شے کے معیار کو پرکھنا ہے تو شاعری کو فوقیت ان معنوں میں ہے کہ وہ واقعی خلاقی ہے اس لیے دنیا کے تمام ادبوں میں جو مرتبہ شاعروں کا ہے وہ دوسری اصناف والوں کا نہیں۔ اس لیے اردو زبان و ادب میں بھی نثر سے زیادہ شاعری نے ادب کے فروغ میں حصہ لیا۔

حسن وقار گل: آپ کے خیال میں موجودہ ادب میں کون سی تحریکیں اور کون سے رویے روبہ عمل ہیں؟

فرمان فتحپوری: تحریک کے طور پر کوئی بہت بڑی چیز ایسی ابھر کر سامنے نہیں آئی جسے ہم واقعی تحریک کا نام دے سکیں کچھ رجحانات کام کر رہے ہیں جو موجودہ زندگی کے اصل تقاضے ہیں اسے جدیدیت کا نام دیا جاسکتا ہے اور کوئی تحریک ایسی نہیں جو ادب کے سلسلے میں کوئی نمایاں کام انجام دے رہی ہو۔ صرف جدت پسندی کا ایک رجحان ہے جس میں ادب کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

حسن وقار گل: کیا علامت نگاری آج شعر اور افسانے میں اہمیت نہیں رکھتی۔ بصورت تحریک؟

ڈاکٹر فرمان صاحب: علامت کا استعمال تو پہلے بھی تھا لیکن اب مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ ابہام اور اشکال کا استعمال ہو جو طویل اور دور از کار یا استعارہ در استعارہ کی شکل اختیار کرلے افسانے میں علامت نگاری کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے ایک خاص پہلو کو افسانہ نگار خالص اشعار میں بیان کرنا چاہتا ہے۔ یعنی کہتا کچھ ہے اور لکھتا کچھ ہے۔ اس کے الفاظ سے مفہوم واضح نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر اشارات کے ایسے دبیز پردے ہوتے ہیں کہ قاری کو خود اس کے پردے ہٹاکر حقیقت کی تلاش کرنا پڑے۔

حسن وقار گل: موجودہ دور کے نوجوان ادیبوں، شاعروں اور محققوں میں آپ کن افراد سے بہت زیادہ پر امید ہیں؟

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: میرا یہ رویہ ہے کہ میں ماضی سے زیادہ حال اور حال سے زیادہ مستقبل کو خوش آیند سمجھتا ہوں اور حال سے نا مطمئن رہنا ایک فطری چیز ہے اور ماضی سے چپکے رہنا احمقانہ بات ہے۔ رہا مستقبل تو حال سے زیادہ مستقبل سے پُر امید ہوں۔ اور نوجوانوں کے متعلق میرا یہ تاثر ہے کہ ان کی جو ذہانت ہے اور ان کے سوچنے کا جو نیا پن ہے اور ان میں زندگی کو دور تک دیکھنے کی جو صلاحیت ہے وہ ہمارے دور (نوجوانی میں) میں بھی اس طرح نہیں تھی آج ادب کا طالب علم زیادہ باشعور ہے اور پڑھتا ہے یہ اور بات ہے کہ زندگی کی پیچیدگی کی وجہ سے اسے یکسوئی سے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا لیکن اسے جب بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملتا ہے وہ انتہائی ذہانت کے ساتھ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاکر داد و تحسین حاصل کرتا ہے ایسے چند ذہین نوجوانوں میں میں چند نام لے سکتا ہوں مثلاً کراچی سے سحر انصاری، اظہار زیدی، ریاض صدیقی، معین الدین عقیل جب کہ شاعری میں انور افسر شعور شامل ہیں یا نوجوانوں سے کچھ ذرا زیادہ مشفق خواجہ ہیں جنھوں نے حال ہی میں جائزہ مخطوطات پر بڑا اہم اور معیاری تحقیقی کام کیا ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل سے بھی مجھے ایسے ہی کسی بڑے تنقیدی کام کی توقع ہے۔ مگر ان کی توجہ تاریخ اور اسلامیات کی جانب زیادہ ہوتی جارہی ہے اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو تنقید کے کاموں میں صرف کریں تو کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی ہی میں میرے شاگردوں میں ایک دو اور ایسے نوجوان ہیں جن کی ذہانت، لگن، مطالعہ اور محنت کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ

اندازہ ہوتا ہے کہ خدا نے انھیں کسی بہت بڑے کام کے لیے بنایا ہے مجھے مستقبل میں ان سے کسی نہایت اہم اور بڑے کام کی توقعات وابستہ ہیں لیکن میں فی الوقت وہ نام نہیں لینا چاہتا کسی اور مناسب وقت پر وہ نام بھی لے دوں گا کراچی کے علاوہ دوسرے شہروں اور صوبوں میں جن نوجوانوں سے میں پر امید ہوں ان میں بلوچستان سے نوجوان شاعر اعتبار ساجد، ملتان سے اصغر ندیم حیدر آباد میں ضیار انجم لاہور میں صادق سعید یحیٰی امجد اور امجد اسلام امجد شامل ہیں۔ ان تمام نوجوان ذہنوں سے جن میں افسانہ نگار، نقاد، مضمون نگار، شاعر اور صحافی بھی ہیں مجھے مستقبل میں بھی بہت بہتر امیدیں وابستہ ہیں۔

حسن وقار گل: آپ کس قسم کے ادب کو پسند کرتے ہیں؟

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: مجھے وہ ادب پسند ہے جو زندگی کو خیر، پیغام تہنیت اور پیغام مسرت کے ساتھ ساتھ جد وجہد کا ولولہ انگیز جذبہ عطا کرتا ہو اور زندگی سے قریب تر ہو۔

حسن وقار گل: کیا مذہب ادب کی ترقی میں کبھی رکاوٹ بنا؟

فرمان صاحب: میرے نقطہ نظر کے مطابق مذہب نہ تو سائنس اور نہ ہی ادب کی ترقی میں رکاوٹ بنا اور نہ ہی مذہب ادب کی ترقی میں کبھی حائل ہوا۔ رکاوٹ تو ادیب و شاعر کا اپنا ذہن بنتا ہے۔ اگر ہم سائنس، فلسفہ یا حدیث ان تینوں چیزوں کو ادبی زاویے سے پڑھیں تو ہمارا پہلا احساس یہ ہونا چاہیے کہ ادب پڑھ رہے ہیں، سائنس، فلسفہ یا حدیث نہیں۔ اگر کوئی شخص اعلا معیار سے لفظوں کو جامہ پہناتا ہے تو وہ ادب ہے۔

حسن وقار گل: ڈاکٹر صاحب آپ کی توجہ ادب کی جانب کیوں کر ہوئی اور آپ کی ابتدائی کاوشیں کیا تھیں؟

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: میرا طالب علمی کا ماحول ادبی تھا۔ ہمارے زمانے میں پیدا ہوتے ہی شعر سننے میں آتا تھا۔ اور بے شمار شعر یاد ہو جاتے تھے۔ اور اس میں شعر کہنے اور مشق کرنے کی عادت ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا میں نے شعر بھی کہے لیکن تنقید کی طرف زیادہ راغب ہوا۔ سلسلہ یہ تھا کہ میں نے سب سے پہلے ۱۹۴۴ء یا شاید ۱۹۴۵ء میں کلیم الدین کی شاعری پر ایک تنقیدی مضمون لکھا۔ میں نے ان کی کتاب پڑھی اور اس پر رد لکھا جو کہیں شائع نہیں ہوا لیکن میں میرا جو پہلا مضمون شایع ہوا وہ "زبان اور رسم الخط" تھا جو میری کتاب "تحقیق و تنقید" میں شامل ہے۔ یہ بحث پروفیسر احتشام صاحب نے اٹھائی تھی اور نگار کے اڈیٹر نے بڑے بڑے لوگوں کو اظہار کی دعوت دی تھی جب کہ احتشام صاحب کا موقف یہ تھا کہ رسم الخط بدل دینے سے زبان بدل نہیں جاتی میں نے اس حوالے سے اپنے مضمون میں ثابت کیا کہ رسم الخط بدل دینے سے زبان نہ صرف بدل جاتی ہے بلکہ ختم ہو جاتی ہے۔ بعد میں احتشام حسین صاحب نے یہ موقف تسلیم کر لیا اور نگار کے ایڈیٹر کو تعریفی خط لکھا اور کہا کہ میرا موقف بھی یہی تھا میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں دوسروں کا موقف کیا ہے۔ اسی سلسلے میں حکومت پاکستان نے مجھ سے فرمائش کر کے جو کتاب لکھوائی وہ "ہندی اردو تنازعہ" ہے یہ ہندو مسلم سیاسی تعلقات کے اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے جسے نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شایع کیا ہے میری ابتدائی کاوشوں میں ۵۲ء میں جو مضمون شایع ہوا وہ تھا "غالب کے کلام میں استفہام" جو کہ ایک تنقیدی مضمون ہے اور یہی میری تنقید کی ابتدا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان نے غالب کے سو سالہ جشن کے موقع پر غالب پر کچھ گئے اور بعض مضامین کا ایک انتخاب "غالب تنقید کے سو سال" کے نام سے شایع کیا ہے اس میں بھی یہ مضمون شامل ہے اس مضمون میں میں نے بتایا ہے کہ غالب نے ا... شعر ہیں۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا میں "کس کی" کا اشارہ خدا کی طرف ہے۔ اسی زمانے میں ایک مضمون "غالب تاثر میں" لکھا بات یہ ہے کہ مجھے آٹھویں جماعت سے

غالب کا پورا دیوان یاد تھا۔ انٹر تک ریاضی پڑھی جتنی اردو سے دل چسپی تھی اتنی ہی ریاضی سے تھی اور یہ مزاج کی مشکل پسندی تھی کہ کٹھن سے کٹھن بات حل کرنے میں خوشی حاصل ہوتی تھی۔

حسن وقار گل: ڈاکٹر صاحب کیا شاعری سے آپ کو اب بھی شغف ہے؟

ڈاکٹر فرمان فتحپوری: کیوں نہیں زبردست دل چسپی ہے کبھی کبھی موڈ یا کوئی واقعہ متاثر کرے تو شعر کی صورت ہو جاتی ہے۔ نثر کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ شعور اور عقل کے سہارے لکھی جائے لیکن شعر شعور اور عقل پر حاوی ہو جاتا ہے۔ میری شاعری آج کل کے نوجوانوں کے لیے انھیں کی شاعری اور ذہن کے مطابق تو ہے میں نے نظمیں لکھیں جن میں مزاحیہ نظمیں بھی ہیں اور سقوط ڈھاکہ جیسی المیہ نظم بھی شامل ہے۔ غزل بھی کہتا ہوں یہ چیز تو ایسی ہے جو چھٹ ہی نہیں سکتی بس ذرا مشاعروں کے لیے نہ وقت ملتا ہے اور نہ ہی کہیں اشاعت کے لیے بھیجتا ہوں۔

حسن وقار گل: ڈاکٹر صاحب آپ نے ابتداً کن بزرگوں اساتذہ اور ادیبوں اور شاعروں کے اثرات قبول کیے؟

ڈاکٹر فرمان صاحب: بات یہ ہے کہ میں نے میٹرک درس نظامیہ سے پاس کیا جہاں اسکول کی ہر تقریب میں یہ معزز ہستیاں شامل ہوا کرتی تھیں جن کا میں شاگرد تو نہیں لیکن ان ہستیوں کے اچھے شاگرد وہیں پڑھایا کرتے تھے۔ ان ہستیوں میں مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالوحید، مولانا حسن الدین خاموش، مولانا بدیع الزماں خان، علامہ نیاز فتحپوری، مولانا عبدالرزاق کانپوری عارف ہسوی اور مولوی عبدالحیٔ شامل ہیں۔ ان عظیم شخصیتوں کی بدولت وہاں علم و ادب کی ایک خاص فضا قائم تھی۔ میں نیاز صاحب سے بھی اتنا زیادہ قریب نہیں رہا بلکہ ان سے صحیح معنوں میں ۵۰ء میں متعارف ہوا۔ لیکن میں نے سب سے زیادہ جس شخصیت کا اثر قبول کیا وہ مولانا حسرت موہانی کی شخصیت ہے کیوں کہ میں نے بھی وہیں پڑھا ہے جہاں انھوں نے پڑھا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے لیے ہونے والے انتخابات میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا اور ان کی قوت ارادی جذبہ اور سادگی میرے لیے متاثر کن تھی۔

حسن وقار گل: نگار پاکستان سے آپ کی وابستگی کب سے ہے آج کل اشاعت کے کن مراحل میں ہے؟

فرمان صاحب: ۱۹۶۲ء سے اس کی ادارت میں شریک ہوا۔ آج کل یہ ایک ہزار چھپتا ہے مگر مصروفیت اور معیار کے سبب مستقل نہیں آپاتا اور اس کا معیار یہ ہے کہ معیاری مقالے ہی اس میں شایع ہوتے ہیں۔

حسن وقار گل: ڈاکٹر صاحب آپ کے خیال میں آج کا جدید ادب کسی مخصوص طبقے کے لیے ہے یا عوام بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں؟

ڈاکٹر فرمان صاحب: آج کا وہ ادب جسے جدید ادب کہتے ہیں اس کا تجریدی ہونا۔ ابہام پسند ہونا مشکل پسندی اور پردہ در پردہ اشارات کے سبب صرف ایک مخصوص طبقے تک محدود ہوتا جا رہا ہے اور یہ بات ادب اور ادیب دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

حسن وقار گل: ڈاکٹر صاحب آپ آج کل کن تخلیقی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں اور آپ کی کون سی تصانیف عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں؟

ڈاکٹر فرمان صاحب: میرا اصول یہ ہے کہ جب تک کوئی کام مکمل نہ کیا جائے تذکرہ فضول ہے۔ اور جب آپ نے یہ سوال کر ہی دیا ہے تو میں تصانیف کا نام تو نہیں بتاؤں گا بلکہ یوں سمجھیے کہ میری ایک دو میں پریس میں ہیں اور ایک دو پریس میں جانے والی ہیں جو عنقریب منظر عام پر آجائیں گی۔ اس کے بعد آپ کو خود پتا چل جائے گا کہ میں نے کن موضوعات پر کام کیا ہے۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ جن موضوعات پر کام نہیں ہوا ہے انھی موضوعات پر کام کرنے کا عادی ہوں۔

تعارف

ڈاکٹر فرمان فتحپوری جن کا اصل نام سید دلدار علی ہے۔ فتح پور ہنسوا کے ایک معزز علمی گھرانے میں ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید عاشق علی ہے جن کا شمار فتح پور کے معزز افراد میں ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم فتح پوری ہنسوا میں "درس نظامیہ" کے تحت حاصل کی اور میٹرک کا امتحان ۱۹۴۶ء میں درجہ اولیٰ میں کیا جس کے بعد مسلم انٹر کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۴۸ء میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان نمایاں طور پر پاس کیا اور چند ماہ کے لیے برٹش حکومت کی جانب سے بحیثیت فارسی مترجم مسقط تشریف لے گئے لیکن چند ماہ بعد ہی واپس بھارت آگئے اور پاکستان کے لیے ہجرت کی۔ پاکستان اکریسٹرل گورنمنٹ کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں ڈویژنل اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصے قانون کی بھی پریکٹس کی اسی زمانے میں اردو کالج کراچی میں جہاں علوم شرقیہ کی تدریس ہوتی تھیں ادیب فاضل اور منشی فاضل کی کلاسوں میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۵ء میں جامعہ کراچی سے بی ایڈ کا امتحان نمایاں نمبروں سے پاس کیا اور سررشتہ تعلیم میں آگئے جہاں سے ٹیچر ٹریننگ انسٹیٹوٹ ناظم آباد کراچی میں تقرری ہوئی۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ درس و تدریس سے شغف رکھنے کے باعث فرمان صاحب نے پاکستان آتے ہی ۱۹۵۰ء میں ایک انجمن "انجمن تعلمات ملیہ" کی بھی بنیاد ڈالی اور جامعہ ملیہ کی پرانی عمارت میں ...... ایک اسکول قایم کیا اور خود بھی اس میں پڑھاتے رہے لیکن یہ اسکول بعد میں سید ہاشم رضا صاحب کی معرفت ڈاکٹر محمود حسین (مرحوم) کے حوالے کر دیا جو جامعہ ملیہ دہلی کی طرز کا ایک ادارہ بنانا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب نے ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو ادبیات کا امتحان اوّل بدرجہ اوّل پاس کیا اور شعبۂ اردو جامعہ کراچی سے منسلک ہو گئے جب کہ ۱۹۶۴ء میں پی ایچ ڈی اور ۱۹۷۲ء میں ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری آج کل جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہونے کے علاوہ "نگار پاکستان" کی ادارت کے بھی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات و تالیفات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ تدریس اردو	۱۹۶۲ء	۲۔ اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء	۱۹۶۲ء
۳۔ تحقیق و تنقید	۱۹۶۳ء	۴۔ غالب شاعر امروز و فردا	۱۹۷۰ء
۵۔ اردو کی منظوم داستانیں (پی ایچ ڈی کا مقالہ)	۱۹۷۱ء	۶۔ تاویل و تعبیر	۱۹۷۱ء
۷۔ دریائے عشق اور بحر المحبت	۱۹۷۱ء	۸۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ	۱۹۷۱ء
۹۔ اردو شعراء کی تذکرہ نگاری (ڈی لٹ کا مقالہ)	۱۹۷۲ء	۱۰۔ تدریس اردو (ترمیم و اضافہ شدہ)	۱۹۷۲ء (طبع دوم)
۱۱۔ زبان اور اردو زبان	۱۹۷۳ء	۱۲۔ قمر زمانی بیگم	۱۹۷۳ء
۱۳۔ نیا اور پرانا ادب	۱۹۷۴ء	۱۴۔ میر انیس حیات اور شاعری	۱۹۷۴ء

۱۵۔ اردو کی نعتیہ شاعری	۱۹۷۴ء	۱۶۔ تحقیق وتنقید (طبع دوم)	۱۹۷۵ء
۱۷۔ اردو املا اور رسم الخط	۱۹۷۶ء	۱۸۔ ارمغان گوکل پرشاد	۱۹۷۶ء
۱۹۔ ہندی اردو تنازعہ ہندو مسلم سیاسیات کی روشنی میں (حکومت کی فرمائش پر لکھی)	۱۹۷۷ء	۲۰۔ اقبال سب کے لیے	۱۹۷۸ء

ان تمام تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے نگار پاکستان کے لیے متعدد خاص نمبر ترتیب دیئے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ نیاز فتحپوری نمبر (جلد اول)	۱۹۶۳ء	۲۔ نیاز فتح پوری نمبر (جلد دوم)	۱۹۶۳ء
۳۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر	۱۹۶۳ء	۴۔ اصناف ادب نمبر	۱۹۶۶ء
۵۔ اصنافِ شاعری نمبر	۱۹۶۷ء	۶۔ مسائل ادب نمبر	۱۹۶۹ء
۷۔ غالب نمبر	۱۹۷۰ء	۸۔ اکبر الہ آبادی نمبر	۱۹۷۱ء
۹۔ سر سید احمد نمبر (حصہ اول)	۱۹۷۱ء	۱۰۔ سر سید احمد نمبر (حصہ دوم)	۱۹۷۱ء
۱۱۔ میر انیس نمبر	۱۹۷۲ء	۱۲۔ مولانا حسرت موہانی نمبر	۱۹۷۳ء
۱۳۔ ڈاکٹر محمود حسین نمبر	۱۹۷۵ء	۱۴۔ قائد اعظم نمبر	۱۹۷۶ء
۱۵۔ اقبال نمبر	۱۹۷۶ء	۱۶۔ جوہر نمبر (حصہ اول)	۷۸-۱۹۷۷ء
۱۷۔ جوہر نمبر (حصہ دوم)	۱۹۷۸ء		

ڈاکٹر صدیقہ ارمان

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ایم۔اے اردو (پرائیویٹ) کرنے کی افتاد پڑی تھی۔کہیں سے کوئی رہنمائی یا ہمت افزائی میسر نہیں تھی، میری چھوٹی بہن عفیفہ ان دنوں جامعہ کراچی کی باقاعدہ طالبہ تھیں۔ان کے ہمراہ شعبۂ اردو جا پہنچی۔فرمان صاحب کی کلاس ہو رہی تھی۔کلاس میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کرنے پر موصوف نے فراخ دلی سے فرمایا ؏

آئے جو آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

اسی روز میں نے کلاس میں پہلی بار فرمان صاحب کا لیکچر سنا۔آج تک وہ شعر یاد ہے جو اس روز کے لیکچر کا بنیادی محور تھا ؏

ترا غرور، مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

اندازِ تخاطب کی دلکشی تھی کہ پورا کلاس محویت کے عالم میں تھا۔لہجہ کی شگفتگی اور نرمی نے پہلے روز ہی اسیر سا کر لیا۔کچھ یاد نہیں کہ کتنی کلاسیں اٹینڈ کیں۔لیکن فرمان صاحب کی شخصیت کا گہرا تاثر ذہن نے قبول کر لیا۔

ریسرچ (پی۔ایچ۔ڈی) کے خارزار میں قدم رکھا تو استاد محترم ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے حکم پر ہر ہفتہ کو یونیورسٹی جانا ہوتا۔بسا اوقات فرمان صاحب سے ملاقات ہوتی۔سلام کے جواب میں چلتے چلتے، مسکرا کر خیریت پوچھتے، کبھی کبھی "کام" کے بارے میں بھی واجبی سا سوال کر لیتے۔

ایک مرتبہ کوری ڈور کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہم لوگ گپ شپ میں مشغول تھے کہ اچانک فرمان صاحب کا شگفتہ سا جملہ سماعت کو محظوظ کر گیا "آج جمعرات نہیں، اس لیے کچھ نہیں ملے گا۔"

انھیں دلنواز دنوں کی بات ہے کہ ایک روز میں اپنی دوستوں سے بحث میں الجھ گئی۔بحث تھی ایک زندہ شاعر کے بارے میں، بڑے اور چھوٹے کی۔طے یہ ہوا کہ کسی استاد سے فیصلہ کرائیں۔فرمان صاحب کی عدالت میں پہنچے، پوری بات توجہ سے سن کر بولے "وہ بھی کوئی شاعر ہے۔"

ابھی اپنے نظریہ کی فتح مندانہ تائید پر چپکے چپکے خوش ہو رہی تھی کہ فرمان صاحب نے مخاطب کیا "لاؤ چائے پلاؤ۔" اس بدنصیب شاعر کے بارے میں یہ تمہاری ہی رائے ہوگی اور چوں کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہوا ہے اس لیے تم پر چائے DUE ہو گئی۔"

وقت کے سیلِ رواں نے گورنمنٹ کالج برائے خواتین، سعود آباد پہنچا دیا۔چند سال بعد جب یونیورسٹی سے ڈگری کلاسوں کے اجرا کی اجازت مانگی گئی تو کالج کے معائنہ کے لیے جو ٹیم وہاں پہنچی، ان میں ڈاکٹر صاحب بھی ماہرین میں شامل تھے۔مجھے وہاں دیکھا تو مسکرا کر بولے "ڈگری کلاسوں کی اردو کی طرف سے تو میں مطمئن ہوں۔"

چھ سات ماہ ڈاکٹر صاحب کی ماتحتی میں بھی گزرے (شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے صدر تھے) اسی حیثیت

میں ریٹائر ہوئے) میں نے اسی سال شعبہ میں استاد کی حیثیت سے کارِ منصبی سنبھالا تھا۔ اتنے بڑے ادارے میں پڑھانے کا پہلا موقعہ تھا، عجیب قسم کا خوف سا تھا دل میں! میری دوستوں نے پہلے ہی ڈرایا ہوا تھا کہ کلاس میں کھڑی تم کانپ رہی ہوگی، تمہارے صدرِ شعبہ پانی کا گلاس منگوا کر تمہیں دیں گے اور تمہارے بارے میں فیصلہ یہ ہوگا کہ نااہل استاد منتخب کر لیا گیا ہے۔

مگر ہوا یوں کہ صدر صاحب نے کلاس میں جا کر کبھی ہمارے لیکچر کا معائنہ کیا ہی نہیں۔ کئی ماہ گزر گئے تو معلوم ہوا کہ کئی بار موصوف نے ہم سب (نو منتخب) اساتذہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا ہے لیکن کبھی کسی کو خوف زدہ یا بددل نہیں کیا۔

یہ ان کے مزاج کا ایک نمایاں وصف ہے کہ درشت لہجہ یا سخت رویہ بالعموم نہیں اپناتے۔ کام بہت سا کرا لیتے ہیں لیکن اس کا بار محسوس نہیں ہونے دیتے۔ ہمت افزائی کرتے جائیں گے اور کام بڑھتا جائے گا۔

فرمان صاحب کی شخصیت کسی حد تک عجیب سی ہے (غریب نہیں) طالب علم ان کے مداح رہتے ہیں، ماتحت خوش مگر ہم عصر شاکی ہے۔ کلاس میں یہ کبھی اپنے آپ کو اس قدر ہولناک بنا کے پیش نہیں کرتے کہ بندہ دم نہ مار سکے، نہ علمیت کا ایسا رعب جماتے کہ طالب علم خود کو بونا اور ان کو دیو سمجھ کر سہما بیٹھا رہے۔ طلبہ کو سوال پوچھنے پر اکساتے ہیں اور پھر جواب سے مطمئن بھی کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات بھری کلاس میں شرمندہ بھی ایسا کرتے ہیں کہ ......۔

بات سے بات پیدا کرنے میں بھی موصوف ماہر ہیں۔ گفتگو بڑی لچھے دار ہوتی ہے ایسی کہ سامع اس کے سحر میں گم ہو کر یہ مہلت ہی نہیں پاتا کہ حقیقت و صناعی میں تفریق کر سکے۔ دورانِ گفتگو اشعار و محاورات کے ایسے ٹانکے لگاتے ہیں کہ ذوقِ سخن کو مہمیز سی ہوتی رہے۔ سخن گسترانہ گفتگو میں مخاطب کو اپنے وجود کی کلام کا احساس ہی نہیں رہتا۔

ڈاکٹر صاحب بامروت آدمی ہیں، اکثر لوگ ان کی اس صفت کا ذکر کرتے ہیں۔ مجھے خود بارہا اس کا تجربہ ہوا لیکن کبھی کبھی ان کا لہجہ ایسا سپاٹ اور انداز ایسا پھیکا بھی ہو جاتا ہے کہ تعجب کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اور آدمی صرف اس کے اسباب پر غور کرتا رہ جاتا ہے۔

ایک اور صفت بھی ڈاکٹر صاحب کی قابلِ تحسین ہے کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے اگر اس کا اندیشہ ہو تو اصولوں کی قربانی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اصول انسانوں کے لیے ہیں، انسان اصولوں کے لیے نہیں' ان کا وطیرہ ہے۔

کراچی کی ادبی محفلوں میں تقریر کرتے ہوئے انھیں ہزاروں افراد نے سنا ہے۔ کیسا ہی دقیق، ثقہ اور سنجیدہ موضوع ہو، ڈاکٹر صاحب کا شگفتہ اور زندہ لہجہ اسے سہلِ ممتنع بنا دیتا ہے۔ "عمر خیام کی رباعیات" سے لے کر "نیاز فتح پوری کے فن تک" ان کے لیکچرز سنے ہیں۔ "شعر میں کہتا ہوں سمجھے تم کرو" کے مصداق کبھی موصوف نے موشگافیوں میں نہیں الجھایا، ہر مزاج و دلچسپ اندازِ بیاں ہی ان کا شیوہ ہے۔ اسی دائرہ کے اندر رہتے ہوئے بہت کچھ بتا جاتے ہیں، نہ موضوع سے متعلق تشنگی باقی رہتی ہے اور نہ ہی بارِ گراں کا احساس۔ موضوع زیرِ بحث پر اگر کبھی مطالعہ کا موقعہ نہ بھی ملا ہو تو لہجہ کا اعتماد اس کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ خود اگر کبھی ان کو یہ محسوس ہو کہ سامعین کلی طور پر متوجہ نہیں تو آواز کا 'حجم' بڑھا دیتے ہیں اور اطراف میں تیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں آج کل ڈاکٹر صاحب "اردو ڈکشنری بورڈ" کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ لغت کی کئی جلدیں موصوف

کی زیر نگرانی چھپ چکی ہیں تیزی سے کام کی پیش رفت ہو رہی ہے، اسٹاف میں بھی اضافہ ہوا ہے، الگ الگ سیکشن بھی بن گئے ہیں۔ جب کبھی آفس میں ڈاکٹر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا، چاق چوبند، مستعد اور فعال پایا۔ تھوڑی دیر اگر ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں بیٹھ گئے تو بہت سے لطائف اور خوب صورت اشعار سننے کو ملے۔ کسی بات سے ان کے ضعف و ناتوانی کا اظہار نہیں ہوتا لباس، وضع قطع نشست و برخاست، گفتگو، لہجہ کی شوخی، آنکھوں کی چمک، ہر انداز سے توانائی عیاں ہے۔

فرمان صاحب کی بہت سی تصانیف ہیں چوں کہ محققانہ یا ناقدانہ انداز اس وقت مقصود نہیں اس لیے نہ تعداد کتب لکھنی ہے اور نہ کسی تصنیف کے حسن و قبح کا ذکر مناسب ہے۔ بس یہ کہ بہت تیزی سے لکھتے ہیں۔ سنا کہ فرمان صاحب فلاں موضوع پر لکھ رہے ہیں، اچانک معلوم ہوا کہ کتاب مارکیٹ میں پہنچ گئی ہے۔ دو آدمی اس اعتبار سے بہت زود نویس اور فعال ہیں۔ ایک ڈاکٹر جمیل جالبی کہ ایک تصنیف ان کی بازار میں ہوتی ہے، دوسری زیر طبع، تیسری زیر تصنیف اور چوتھی زیر غور یا زیر منصوبہ۔ دوسرے فرمان صاحب خوش نصیبی میں بھی یہ دونوں حضرات ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ کتابیں ان کی اتنی چھپتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ پبلشر ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ ادبی دنیا میں نام ان کے بلند ہیں۔ شہرت و نام وری کے اعتبار سے یہ حضرات مقبولین میں شمار ہوتے ہیں۔ باثر و بارسوخ اتنے کہ لوگ ان کی بات ٹالتے ہیں جھجکتے ہیں گھریلو ماحول ان کا ایسے خوشگوار و پر سکون اور معاون ہیں کہ دن رات اپنے تخلیقی و تحقیقی امور میں منہمک رہتے ہیں۔ غالب نے تو ایک جام، میسر آجانے کو جنت نشینی پر ترجیح دی ہے۔

ان تمام اوصاف کے بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ فرمان صاحب کوئی فرشتہ یا دیوتا قسم کی چیز ہیں۔ یقیناً بشری کمزوریاں ان میں ضرور ہوں گی، بلکہ ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان کا خاکہ جن رنگوں سے بنتا ہے وہ طرح دار، دلکش، دل ربا، تابناک اور پائیدار ہیں تاہم ملگجا پن، دھندلاہٹ اور کم رنگی بھی انھیں میں شامل ہے لا

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ سب اچھا کہیں جسے"

میں نے انھیں استاد، صدر شعبہ (یعنی باس) مقرر اور ممتحن کی حیثیت میں دیکھا اور سنا ہے۔ محقق نقاد، شاعر اور ادیب کے روپ میں تھوڑا بہت پڑھا ہے۔ منتظم اعلا (نگار و نیاز کی سالانہ تقاریب اور اردو لغت بورڈ کی ادبی تقاریب کے حوالے سے) اور میزبان کی حیثیت میں مشغول بھی پایا ہے لیکن پریشان، برہم یا منتشر کبھی نہیں پایا، یا محسوس نہیں ہوا کہ ایسا ہے۔

انسان کی ذات سے کماحقہٗ آگاہی تو خود اسے بھی نصیب نہیں اسی وجہ سے غالب نے اپنی ہستی سے غفلت کو کماحقہٗ سمجھ کر ترجیح دی۔ لیکن خاطر خواہ حد تک آگاہی بھی کم ہی میسر آتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو اتنا ہی دیکھا، سنا اور پڑھا ہے جتنا کہ اوپر بیان کیا۔ البتہ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ تجزیہ کرنے میں میری اہلیت یا نااہلی ثابت ہو سکتی ہے۔

اپنی برارت میں کچھ نہیں کہنا ہے الّا یہ کہ تجزیہ صرف ان چند لمحوں کا نتیجہ ہے جو سلام دعا کے علاوہ چند جملوں پر منحصر تھے۔ میں نے یہ سارے تاثرات ان مجلسوں سے اخذ کیے ہیں جو عوامی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ایسے جلسوں یا ملاقاتوں میں انفرادی توجہ کسی کو میسر نہیں آتی، البتہ انفرادی سوچ ہر اک کی اپنی ہوتی ہے۔